حرمتِ سود

کیا یہ دورِ جدید میں بھی قابلِ عمل ہے؟

مؤلف

ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا

مترجم

مظفر قریشی

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا کسی تعارف کے محتاج نہیں، وہ علم اقتصادیات کے شعبہ کی ایک نہایت قد آور شخصیت ہیں اور گزشتہ ۳۰ سال سے اقتصادی مسائل خصوصاً اسلامی معاشیات اور بینکاری کے نظام پر لکھنے والی اہل علم شخصیتوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، اس موضوع پر ان کی بارہ کتابیں اور ۸۰ کے قریب علمی مقالے بین الاقوامی شہرت کے حامل جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی متعدد کتب اور مضامین دنیا کی بارہ زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ اُردو ترجمے کی سعادت پاکستان کو حاصل ہورہی ہے۔ ڈاکٹر عمر چھاپرا اپنے علم کی وسعت و گہرائی، متوازن خیالات اور راست فکر کے باعث تمام علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دنیا بھر کی مختلف یونی ورسٹیوں اور علمی اداروں میں اسلامی معاشیات اور بینکاری کے موضوع پر ان کی تقاریر کو قابل قدر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ان میں امریکہ، برطانیہ، اسپین، اٹلی، ترکی، مصر، اُردن، ایران اور انڈونیشیا وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر چھاپرا کو ان ہی گرانقدر علمی خدمات کی بنا پر ۱۹۸۹ء میں اسلامی ترقیاتی بینک کا ایوارڈ اور ملک فیصل فاؤنڈیشن کی طرف سے شاہ کنگ فیصل ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر چھاپرا امریکہ کی وکانسن (Wisconsin) اور کنٹکی (Kentucky) یونی ورسٹیوں میں اسسٹنٹ اور ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے تدریس کے فرائض انجام دے چکے ہیں اور پاکستان کے انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپ منٹ اکنامکس اور انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ میں بھی کچھ عرصہ کام کر چکے ہیں۔ امریکہ میں بھی ان کی خاصی پذیرائی ہوئی، لیکن انھوں نے اپنی مستقل رہائش کے لیے سعودی عرب کا انتخاب کیا جہاں انھوں نے ۳۵ برس تک سعودی مرکزی بینک (سعودی عربین مانیٹری ایجنسی) میں ۱۹۶۵ء تا ۱۹۹۹ء اقتصادی مشیر کے فرائض انجام دیے۔ سعودی حکومت نے ان کی گرانقدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۸۳ء میں اس وقت کے

وزیر خزانہ شیخ محمد ابا الخیل کی سفارش پر سعودی شہریت عطا کی، اس وقت ملک خالد بن عبد العزیز حکمراں تھے۔ ساما (سعودی عربین مانیٹری ایجنسی) سے ریٹائرمنٹ کے بعد اسلامی ترقیاتی بینک کے جدہ میں واقع ادارے اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (المعهد الاسلامی للبحوث والتدریب) نے بطور مشیر اُن کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔

ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا غیر منقسم ہندستان میں ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ممبئی میں حاصل کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے کراچی آگئے اور نمایاں پوزیشنوں میں میٹرک، بی کام اور ایم کام کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں امریکی یونیورسٹی آف مینوسوٹا (Minnosota) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ زمانۂ طالب علمی ہی سے خدمتِ اسلام کے جذبہ سے سرشار رہے اور اب تک بفضل خدا اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر چھاپرا کی یہ کتاب ان کے تین انگریزی مقالوں کا اُردو ترجمہ ہے اور ہم اُردو دان حضرات کے مطالعے کے لیے اسے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ علمی حلقوں میں وسیع مقبولیت حاصل کرنے والے مقالے چند سال قبل سعودی عرب میں شائع ہوئے تھے اور پھر جنوبی افریقہ کی اسلامی دعوة مومنٹ (Islamic Dawah Movement) نے ان مقالوں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں ایسے سوالات کے بھی جواب دیے ہیں، جو پاکستان کے لیے بھی خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ عصر حاضر کے ان اہم سوالات کا بھی جواب دیا گیا ہے، جن کا سامنا حرمت سود سے دلچسپی رکھنے والوں کو جا بجا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً کیا اسلام نے واقعی سود کو حرام قرار دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیوں؟ اور اس کے پیچھے کیا حکمت کارفرما ہے۔ اور سب سے اہم سوال یہ کہ کیا سود کے بغیر بینکاری کا کوئی ایسا متبادل نظام ممکن ہے جو عہد حاضر میں قابل قبول اور قابل عمل بھی ہو، کیوں کہ موجودہ حالات عہد رسالت مآبؐ سے خاصے مختلف نظر آتے ہیں۔

آخر میں خدا کے حضور دست بہ دُعا ہوں کہ اس کتاب کی طباعت واشاعت کے عمل میں شریک تمام حضرات کو اجر عظیم عطا فرمائے اور اس کتاب کو لوگوں کی صحیح سمت میں رہ نمائی کا باعث اور آخرت میں ہماری نجات کا ذریعہ بنا دے۔ (آمین)

دعا کا طالب

غلام احمد اسماعیل

تقدیم

دور جدید میں مغربیت کے تہذیبی سیلاب اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فکری طوفان نے جو مسائل عالم اسلام میں کھڑے کر دیے ہیں، ان میں اگر سب سے اہم نہیں تو ایک انتہائی اہم مسئلہ حرمت سود کے حکم پر عمل درآمد اور ایک غیر سودی معاشی اور مالیاتی نظام کے قیام میں رکاوٹوں اور الجھنوں کا مسئلہ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ سود کی حرمت کا یقین ایک مسلمان کے ایمان کا جزو ہوتا تھا اور سود کی لعنت سے اجتناب اس کی اقتصادی زندگی کا سب سے اہم پہلو سمجھا جاتا تھا۔ ابتدائی اسلام سے لے کر کم وبیش بارہ ساڑھے بارہ سو سال تک مسلمانوں کی اقتصادی زندگی سود کی آمیزش سے بڑی حد تک پاک رہی۔ اکا دکا انفرادی اور مقامی مثالوں کے علاوہ دنیائے اسلام کی تمام تر معاشیات سراسر غیر سودی بنیادوں پر قائم رہی۔

اگرچہ فقہائے اسلام، مفسرین قرآن اور شارحین حدیث نے حرمت ربا کی حکمتوں اور مصلحتوں پر اپنے اپنے زمانے میں تفصیل سے کلام کیا، لیکن ان مباحث کی اہمیت اکثر و بیشتر نظری ہی رہی۔ اس لیے کہ ایک عام مسلمان کے لیے ربا اور سود کی لعنت سے بچنے کے لیے یہ سبب کافی تھا کہ شریعت نے ربا کو حرام قرار دیا ہے۔ ربا سے بچنے کے لیے کوئی مسلمان کبھی حرمت ربا کی دلیلیں اور حکمتیں جاننے کو پیشگی شرط قرار دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے حرمت ربا کی حکمتوں کے بارے میں امام رازی، امام غزالی، علامہ کاشانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے اساطین علم کے عالمانہ مباحث صرف علمی طبقوں تک محدود رہے، اور صرف ان حضرات کی دلچسپی کا مضمون رہے، جن کو حکمت شریعت سے زیادہ اعتنا رہا، عام لوگوں میں ان مباحث کو عام کرنے کی زیادہ ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

دور جدید میں جہاں اسلام کے اور بہت سے احکام کو بحث و جدال کا موضوع بنایا گیا وہاں حرمت سود کے بارے میں بھی طرح طرح کے شبہات پیدا کیے گئے۔ اسلامی تعلیم کی کمی، دینی تربیت اور ماحول کا فقدان، عقائد کی کم زوری، اسلام سے وابستگی پر ایک احساس اعتماد کے بجائے احساس ندامت، جرأت اور قوت ایمانی کے بجائے معذرت خواہانہ رویہ، کاروبار اور تجارت کے اسلامی اصولوں پر عمل درآمد میں عمومی تساہلی، ان سب چیزوں نے مل کر حرمت سود اور غیر سودی نظام کے قابل عمل ہونے کے بارے میں بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں آج بہت سے سوالات کھڑے کردیے ہیں۔ دنیائے اسلام میں تجارت و معیشت سے وابستہ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کی اس اہم ترین معاشی تعلیم کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دوسرے تو دوسرے اور پرائے تو پرائے، اپنوں کے ذہن بھی صاف نہیں ہیں اور خود دنیائے اسلام کے ایک انتہائی موثر حلقے سے سود کے حق میں آوازیں بلند ہونے لگی ہیں۔

ان حالات میں اس امر کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی کہ حرمت سود کی حکمتوں اور مصلحتوں پر نئے انداز سے تحقیق کی جائے اور دور جدید کی زبان اور محاورہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے کہ سود کیا ہے، وہ اسلام میں کیوں حرام ہے، حرمت سود کی اصل حکمت کیا ہے اور کیا غیر سودی بنیادوں پر ایک جدید ترقی یافتہ معاشیات کی تدوین اور بینکاری نظام کی تشکیل ممکن اور قابل عمل ہے۔

بیسویں صدی میں متعدد نامور اہل علم نے اس چیلنج سے عہد برآ ہونے میں امت مسلمہ کی فکری راہ نمائی کی۔ ان حضرات میں مصر کے شیخ محمد ابوزہرہ اور ڈاکٹر محمود ابوالسعود، عراق کے علامہ محمد باقر الصدر، بھارت کے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی وغیرہ کے علاوہ پاکستان کے ڈاکٹر انور اقبال قریشی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، پروفیسر شیخ محمود احمد اور زیر نظر کتاب کے فاضل اور نامور مصنف ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا کا کام سب سے نمایاں ہے۔ موخر الذکر دونوں حضرات کی تحریریں اصلاً انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ موثر ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کے معاشی نظام کی عالمانہ تنقید اور حرمت سود کے اسلامی عقیدے کی علمی توضیح میں ان دونوں حضرات کی تحریریں نہ صرف اسلامی معاشیات بلکہ عمومی انسانی معاشیات کی

عالمگیر تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ ان سطور کے راقم کو یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ معاشیاتِ اسلام کی تاریخ میں پروفیسر شیخ محمود احمد اور ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا وہی مقام رکھتے ہیں، جو مسلم فلسفہ اور کلام کی تاریخ میں امام غزالی اور امام رازی کو حاصل ہے۔

زیر نظر کتاب ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا کے تین اہم اور عالمانہ مقالات کے اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان تینوں مقالات میں جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں حرمت سود اور اس سے متعلق ضروری مباحث کو انتہائی مدلل اور جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ ربا اور سود کے درمیان لفظی خلط مبحث کی بنیاد پر بعض لوگوں نے جو فرق قائم کرنے کی کوشش کی ہے ڈاکٹر صاحب نے قوی دلائل سے اس کی تردید کردی ہے۔ اسی طرح ربا النسیئہ اور ربا بالفضل کے مابین فرق کو بھی بعض لوگوں نے سود کا راستہ کھولنے کے لیے استعمال کرنا چاہا اور عام مسلمانوں کے ذہنوں میں الجھنیں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر چھاپرا صاحب نے کتب احادیث کے مستند حوالوں کی مدد سے ربا کی ان دونوں قسموں کی واضح تشریح کر کے الجھنوں کے سارے راستے بند کردیے ہیں۔

کتاب کا دوسرا باب یا مقالہ حرمت سود کی حکمت سے بحث کرتا ہے۔ یہاں فاضل مصنف نے قدیم فقہائے کرام کے اسلوب سے ہٹ کر خالص معاشی اصولوں کی روشنی میں حرمت سود کی حکمت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ سود کی لعنت فلاح انسانیت اور عدل و انصاف کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس مقالے میں معاشی حقائق، دلائل اور واقعات کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ عدل، جو شریعت اسلامیہ کا بنیادی ہدف ہے اسی صورت میں قائم ہوسکتا ہے، جب انسانوں کی فلاح و بہبود کے تمام مسلمہ تقاضے پورے کیے جا رہے ہوں۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب تمام دستیاب وسائل اس انداز سے استعمال کیے جائیں کہ مناسب رفتار سے سب کی اقتصادی ترقی ہو اور درج ذیل چار مقاصد کا بہتر سے بہتر انداز میں حصول ممکن ہو:

۱- تمام انسانوں کی ضروریات زندگی پوری ہوں۔

۲- تمام لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے لحاظ سے قابل احترام ذریعہ معاش حاصل ہو تاکہ وہ اپنی محنت و کاوش سے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرسکیں۔

۳- آمدنی اور دولت کی تقسیم عادلانہ ہو۔

۴- مالی اور اقتصادی استحکام حاصل ہو۔

ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا نے دلائل کی روشنی میں یہ دکھایا ہے کہ سودی نظام کی موجودگی میں ان مقاصد کا حصول ممکن نہیں۔ یہ مقاصد بدرجہ اتم صرف ایسے نظام میں پورے ہو سکتے ہیں، جس کی اساس حرمت سود اور دوسرے اسلامی تصورات پر ہو۔

کتاب کے آخری باب یا مقالے میں غیر سودی بینکاری نظام کے چند بنیادی اصولوں کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے بعض ایسے سوالات اور شبہات کا جواب بھی دیا ہے، جو حامیان سود وقتاً فوقتاً اٹھاتے رہتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اسلامی معاشیات پر اردو میں دستیاب کتب میں ایک انتہائی اہم، مفید اور وقیع اضافہ ثابت ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اس کے فاضل اور جلیل القدر مصنف کی دوسری کتابوں کی طرح مقبول اور نافع بنائے اور ان کے اس دیرینہ خواب کی عملی تعبیر کو روبہ عمل لانے کی ہم سب کو توفیق دے، جس کی تابندہ جھلکیاں ان کی ہر تحریر میں موجود ہیں۔

محمود احمد غازی

اسلام آباد

۱۷ربیع الاوّل ۱۴۲۵ھ

۸رمئی ۲۰۰۴ء

باب اوّل

کیا سُود اسلام میں واقعی حرام ہے؟

ربا یا سود۔ کس کی حرمت ہے؟

یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ کیا اسلام میں سود واقعی حرام ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے وہ سود نہیں بلکہ رِبا ہے اور سود اور رِبا ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ کیا اس دعوے میں کوئی حقیقت ہے؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن اور حدیث میں جس چیز کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ رِبا ہے۔ قرآن میں چار مختلف مقامات پر رِبا کی حُرمت آئی ہے۔ سب سے پہلی حرمت سورۂ روم کی آیت نمبر ۳۹ میں آئی جو مکہ مکرّمہ میں نازل ہوئی تھی۔ بقیہ تین مقامات سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۶۱، سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳۰ اور سورۂ بقرہ کی آیات ۲۷۵-۲۸۱ ہیں۔ یہ سب آیتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ ان میں سے سورۂ بقرہ والی آیتیں رسول اکرم ﷺ کی زندگی کے آخر زمانے میں نازل ہوئی تھیں۔ انہی آیتوں میں سود کی حرمت میں سب سے زیادہ شدت آئی ہے اور رِبا لینے اور دینے والوں کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ آیت نمبر ۲۷۹ میں یہاں تک شدت ہے کہ جو لوگ سود لیتے ہیں ان کے خلاف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ کیا گیا ہے۔ اتنے سخت الفاظ قرآن نے کسی اور جرم کے لیے استعمال نہیں کیے ہیں۔ ان آیتوں میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ رِبا اور تجارت ایک نہیں ہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام رِبا جو قرض لینے والوں پر باقی ہے اُسے معاف کردیں۔

رسول اکرم ﷺ نے بھی صاف صاف الفاظ میں رِبا کو حرام قرار دیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ان لوگوں پر لعنت نہیں بھیجی جو رِبا لیتے اور دیتے ہیں بلکہ ان لوگوں پر

بھی جو رِبا کے معاہدے کو لکھتے ہیں اور وہ دو افراد بھی جو گواہ بنتے ہیں[1]۔ انھوں نے جان بوجھ کر رِبا لینے اور دینے کو چھتیس بار زنا کرنے اور اپنی ماں کی اسی طرح بے حرمتی کرنے سے بھی زیادہ بُرا قرار دیا ہے[2]۔

قرآن اور سنت میں رِبا کی اس قدر سختی سے مذمت کے ہوتے ہوئے اور رب العزت کے اس اعلان کے بعد کہ ہم نے تمھارے دین کو مکمل کر دیا ہے (سورۂ المائدہ۔ آیت نمبر ۳) یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اس کے معنی کو اس قدر مبہم رکھا گیا ہو کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی کچھ لوگ اس کے حقیقی معنی سمجھنے سے قاصر ہوں۔ چناں چہ یہ ضروری ہے کہ رِبا کے حقیقی معنی سمجھے جائیں۔ اس مقصد کے لیے اسلام کے اصل مصادر کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

رِبا کے لفظی معنی ''بڑھنا''، ''زیادہ ہونا''، ''پھیلنا'' یا ''بالیدگی'' اور ''نشو ونما'' کے ہیں[3]۔ تاہم ہر اضافے کو اسلام نے منع نہیں کیا ہے۔ تجارت میں جو منافع ہوتا ہے اس سے بھی اصل رقم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اس کی ممانعت نہیں کی گئی ہے۔ چناں چہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز کی ممانعت کی گئی ہے؟ اس سوال کا صحیح اور مسکت جواب دینے والی تو خود رسول اکرم ﷺ کی ذات مبارک ہی ہو سکتی ہے جو قرآن کو سب سے زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ایک حدیث میں انھوں نے قرض کے عوض کسی چھوٹے سے چھوٹے تحفے یا خدمت وصول کرنے کو بھی رِبا قرار دیا ہے۔ ایک اور حدیث میں انھوں نے قرض دینے والے کو اصل رقم کے علاوہ ایک پلیٹ کھانا دینے یا قرض لینے والے کی سواری پر سوار ہونے سے بھی منع فرمایا ہے[4]۔ رسول اکرم ﷺ کی اس تشریح کے بعد پہلے سے طے شدہ شرح سے مالی معاوضہ وصول کرنے کی گنجائش تو کسی صورت سے پیدا نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں خود رسول اکرم ﷺ نے رِبا کو اس چیز کے برابر قرار دیا ہے، جسے عام فہم زبان میں آج کل ''سود'' کہا جاتا ہے۔

رِبا کی اسی تعریف کی عکاسی ہمیں اسلامی تاریخ کے تمام علماء کی تحریروں میں ملتی ہے۔ قرآن کریم کی کوئی بھی تفسیر یا احادیث کی کوئی شرح یا عربی زبان کی کوئی بھی لغت ایسی نہیں ہے، جس میں رِبا کو مختلف معانی پہنائے گئے ہوں مثال کے طور پر القرطبی (متوفی ۶۷۱ھ/ ۱۰۷۰)، جن کا شمار قرآن کے نامور مفسروں میں ہوتا ہے، نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ''تمام مسلمان اپنے رسول ﷺ کی اس بات پر متفق ہیں کہ ادھار دی جانے والی رقم میں کسی بھی اضافے کی شرط

کو رِبا تصور کیا جائے گا خواہ یہ مٹھی بھر چارہ ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے، یا اناج کا ایک دانہ''۔(۵) اسی طرح ابن منظور (متوفی ۷۱۱ھ/ ۱۳۱۱ء) نے بھی اپنی تیار کردہ عربی زبان کی مستند لغت ''لسان العرب'' میں واضح طور پر لکھا ہے کہ جس چیز کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ ہر ایسا قرض ہے، جس پر اصل سے زیادہ رقم یا کوئی منفعت وصول کی جائے۔(۶)

رِبا کے اسی معنی کی بنا پر اسلامی تاریخ کے شروع ہی کے دور سے رِبا کو اُس اضافی رقم سے تعبیر کیا گیا ہے، جو قرض دار کو اصل رقم کے علاوہ ایک معاہدے کے تحت ادا کرنا پڑتی ہے یا قرضے کی میعاد میں توسیع کروانے کے لیے دینی پڑتی ہے۔(۷) اسی بنا پر فقہاء کی بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں جو رِبا کے موضوع پر منعقد ہوئیں متفقہ طور پر تسلیم کیا گیا کہ موجودہ زمانے میں بنکوں کا ''سود'' بھی رِبا ہی کی تعریف میں آتا ہے۔ ان کانفرنسوں میں وہ کانفرنسیں بھی شامل ہیں، جو ۱۹۵۱ میں پیرس میں اور ۱۹۶۵ میں قاہرہ میں منعقد ہوئیں۔ یہی حال ان کانفرنسوں کا ہے، جو ۱۹۸۵ میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم (OIC) کے تحت قاہرہ میں اور رابطۂ عالم اسلامی کے تحت مکہ مکرمہ میں منعقد ہوئیں۔(۸) اس بڑے پیمانے پر اجماع امت کے بعد چند انفرادی آرا، جو اس اجماع کے خلاف ظاہر کی جائیں، ان کی دینی اعتبار سے کوئی وقعت نہیں۔ ایسی آرا سود کی حرمت کو ختم نہیں کرسکتی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے، جس کی وجہ سے بعض لوگوں کے ذہن میں سود کی حرمت کے بارے میں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ رِبا کی اصطلاح شریعت میں دو مختلف معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ دونوں کے معانی اور مقاصد کو اچھی طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے الجھاؤ پیدا ہوسکتا ہے۔ ان دو اصطلاحوں میں سے پہلی اصطلاح ''رِبا النسیئہ'' ہے اور دوسری ''رِبا الفضل''۔

رِبا النسیئہ

نسیئہ کی اصطلاح کی بنیاد نَسَاءَ ہے، جس کے معنی ملتوی کرنے، مؤخر کرنے یا انتظار کرنے کے ہیں اور مراد وہ مہلت ہے جو قرض دینے والا المقروض کو سود کے عوض قرض ادا کرنے کے لیے دیتا ہے۔ یعنی اگر ایک سال کے بعد قرض ادا کرے گا تو اصل کے علاوہ اس کو اتنی رقم دینی ہوگی اور اگر اس کے بعد مہلت میں توسیع کی ضرورت ہے تو کتنی رقم اور دینی ہوگی۔ اس طرح

رِبا النسیئۃ اس سود کے مساوی ہے جو آج کل قرض پر لیا جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۵ ''وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا...'' میں رِبا کی اصطلاح کا استعمال اسی معنی کے لیے کیا گیا ہے اس لیے اس رِبا کو ''رِبا القرآن'' اور ''رِبا الدُّیُون'' بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ ''رِبا جس کی حرمت قرآن میں آئی ہے'' یا ''وہ رِبا جو قرضوں پر واجب الادا ہے۔''

رِبا النسیئہ کی حرمت کا لازمی مطلب یہ ہے کہ شریعت میں اس بات کی اجازت نہیں کہ کسی قرض کی ادائی کے لیے جو مہلت دی جاتی ہے اس کے عوض کے طور پر ایک مثبت شرح کے حساب سے معاوضہ لیا جائے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ادائی کی شرح کم ہو یا زیادہ (Interest or Usury)، پہلے سے متعین کی گئی ہو یا قابل تغیر (Variable) ہو، اور نقد کی صورت میں ہو یا تحفے اور خدمت کی، اور قرض لیتے وقت ادا کی جائے یا بعد میں قرض کی ادائی کے وقت۔ یہ سب طریقے رِبا کی تعریف میں داخل ہیں۔ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ قرض ذاتی اخراجات (Consumption) کے لیے لیا گیا ہے یا تجارت وصنعت وحرفت (Production) کے لیے۔

یہ دلیل بالکل بے بنیاد ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں سود اس لیے حرام کیا گیا تھا کہ اس وقت غریب لوگ ہی اپنی اشد ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے قرضے لیتے تھے اور اس طرح ان کا استحصال ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ غریب لوگوں کی ضروریات زندگی اسلام کے فلاحی نظام میں قرضہ لیے بغیر ہی پوری ہو جاتی تھیں۔ امیر لوگ ان کی مدد کرتے تھے اور اگر کسی کی اس طرح مدد نہ ہو سکے تو بیت المال موجود تھا۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس مثالی معاشرے میں امیر لوگ غریبوں کی فی سبیل اللہ مدد کرنے کے بجائے انھیں قرض دیں گے اور وہ بھی سود پر۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اُس زمانے میں قرضے تجارت ہی کے لیے جاتے تھے۔ جب قافلے دور دراز کے علاقوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے تو ان کو کافی سرمایہ کی ضرورت ہوتی تھی تاکہ وہ برآمد کے لائق تمام چیزیں خرید کر لے جائیں اور انھیں بیچ کر جو پیسہ وصول ہو اس سے معاشرے کی تمام ضروری اشیاء درآمد کر سکیں۔ ایسی تجارت میں کافی وقت لگتا تھا اور سرمایہ ایک لمبی مدت کے لیے منجمد ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ موسموں کی سختی، راستے کی دشواری اور ڈاکہ زنی کی وجہ سے خطرات بھی بہت تھے۔ یہ بات اسلام کے عدل وانصاف کے تقاضوں کے بالکل خلاف

تھی کہ جو تاجر اتنی محنت کرے اور بے شمار خطرات بھی مول لے وہ تو تجارت میں خسارے کا پورا بوجھ اٹھائے اور سرمایہ دار جس نے سرمایہ فراہم کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا، اس کو تجارت میں نقصان ہونے کے باوجود صرف نفع ہی نفع ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سرمایہ دار کے لیے ضروری ٹھہرایا کہ وہ سُود لینے کے بجائے نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہو۔ اگر وہ نقصان میں شریک نہیں ہونا چاہتا تو پھر وہ نفع میں بھی شریک نہیں ہوسکتا۔

چناں چہ بیسویں صدی کے ایک ممتاز عالم دین شیخ ابوزہرہ نے لکھا ہے کہ اس بات کے لیے ہمیں تاریخ سے کوئی شہادت نہیں ملتی کہ رِبا الجاهلیه (اسلام سے پہلے کا رِبا) ذاتی اخراجات کے لیے، لیے گئے قرضوں پر تھا اور تجارتی اور پیداواری قرضوں کے لیے نہیں تھا۔ حقیقت میں جن قرضوں کا ثبوت ایک محقق کو تاریخ کے صفحات میں ملتا ہے وہ پیداواری قرضوں ہی کا ہے۔ اُس زمانے میں عربوں کے حالات، مکہ کا مقام، اور قریش کی تجارت، یہ سب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ قرضے پیداواری اغراض کے لیے ہی لیے جاتے تھے۔(۹) پروفیسر ابراہام یوڈووچ (Abraham Udovitch) جو پرنسٹن یونی ورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف مڈل ایسٹرن اسٹڈیز کے چیئرمین تھے، انھوں نے بھی اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ”مشرق وسطیٰ کے بارے میں ایسی کوئی دلیل قابل قبول نہیں جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ اُس زمانے میں قرضے صرف ذاتی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے لیے جاتے تھے اور پیداوار کے لیے نہیں۔“(۱۰)

اسی وجہ سے مسلمانوں کے تمام مذاہب فکر کے علماء میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ رِبا النسیئہ سود ہی کے مترادف ہے اور حرام ہے اور یہ کہ یہ حرمت سخت، قطعی اور غیر مبہم ہے۔(۱۱) شریعت کی رُو سے یہ ضروری ہے کہ سرمایہ دار نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہو اور یہ کہ اس نفع یا نقصان کی تقسیم شریعت کے عادلانہ اصولوں کی بنیاد پر ہو۔

رِبا الفضل

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرضوں پر سود ”رِبا النسیئہ“ ہے تو پھر ”رِبا الفضل“ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں اسلام نے سود کو حرام اور تجارت کو جائز قرار دیا ہے وہاں اس نے تجارت میں ہر چیز کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام صرف اس ناانصافی اور ظلم کو ختم نہیں کرنا چاہتا جو سودی نظام میں ہوتی ہے بلکہ وہ تجارت سے بھی نفع کمانے کے تمام ناجائز اور غیر عادلانہ طریقے ختم کرنا چاہتا ہے۔ تجارتی سودوں میں جو ”فاضل“ رقم تاجر یا خریدار

دھوکے اور بے ایمانی کے ذریعے اپنے مدمقابل سے حاصل کرتا ہے اسے ''رِبا الفضل'' کہتے ہیں۔ عربی زبان میں چوں کہ رِبا کے لغوی معنیٰ ''زیادہ'' کے ہوتے ہیں، اس آیت میں رِبا سے مراد ہر وہ ''زیادتی ہے، جس کے مقابل میں کوئی عوض نہیں''۔(۱۲)

رِبا الفضل کی تحریم کا مقصد تجارت میں عدل و انصاف کو ہر اعتبار سے یقینی بنانا ہے۔ اسلام ہر قسم کے استحصال کو ختم کرنے کا متمنی ہے اور رِبا کے بھی تمام چور دروازوں کو بند کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اسلامی فقہ کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہر وہ چیز حرام ہے، جو حرام تک پہنچنے کا ذریعہ بنے۔ چوں کہ کئی مختلف طریقوں سے لوگوں کا استحصال ہوسکتا ہے اور ان کو دھوکا دیا جاسکتا ہے اس لیے رسول اکرم ﷺ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ ایک مسلمان ستر (بہت سارے) طریقوں سے رِبا میں ملوث ہوسکتا ہے(۱۳)۔ اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس چیز کے جواز کے بارے میں تمھارے ذہن میں شبہ پیدا ہوتا ہے اسے چھوڑ دو اور وہ کام کرو جو شبہے سے بالاتر ہو''۔(۱۴)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی وجہ سے فرمایا کہ ''سب سے آخر میں رِبا والی آیت نازل ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ رسول اکرم ﷺ رِبا کی پوری طرح تشریح فرماتے آپ ﷺ اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔'' اس لیے تم صرف رِبا سے ہی نہیں بلکہ ''ریبہ'' سے بھی بچو۔(۱۵) ریبہ کا ماخذ ''رَیب'' ہے، جس کے لفظی معنیٰ ''شک وشبہ'' کے ہوتے ہیں اور مقصود وہ آمدنی ہے، جو رِبا سے مشابہ ہو اور جس سے ذہن میں اس کے جائز ہونے کے بارے میں شبہ پیدا ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رِبا النّسیئہ کے معنیٰ تو لوگوں کے ذہن میں واضح تھے اور اس کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا البتہ رِبا الفضل کے مندرجات کا پوری طرح احاطہ نہیں کیا گیا تھا اس لیے انھوں نے فرمایا کہ ہر اس چیز سے بچو، جس کے ذریعے ظلم و ناانصافی کے قریب ہونے کا بھی تم کو گمان ہو۔

ربا الفضل کی چار مثالیں

پہلی مثال

رسول اکرم ﷺ نے مثال کے طور پر چار مختلف طریقے واضح فرما دیے جن کے ذریعے انسان رِبا الفضل کا مرتکب ہوسکتا ہے، ان میں سے پہلا وہ استحصال ہے، جو تجارت میں ناجائز ذرائع کے استعمال سے کیا جاسکتا ہے باوجود اس کے کہ تجارت بذات خود جائز ہے۔ مثال

کے طور پر انھوں نے ''غَبن المُستَرسِل'' کو بھی رِبا سے تعبیر فرمایا۔[16] غَبن کے معنی ''دھوکے'' کے ہوتے ہیں اور ''مُستَرسِل'' اس سیدھے سادے شخص کو کہتے ہیں جسے بازار کے حالات اور نرخوں کا کوئی علم نہیں۔ ایسے سیدھے سادے شخص سے بازار کے دام سے کم دام پر اس کی چیز خرید لینا یا اسے بازار کے دام سے زیادہ دام پر چیز بیچنا جائز نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں بازار کے دام کے مقابلے میں جو فرق ہے وہ بھی رِبا کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے نَاجِش ''لعنت زدہ'' کو بھی رِبا کھانے والا قرار دیا ہے۔[17] نَاجِش اس شخص کو کہتے ہیں، جو نیلام کے وقت اپنا ایک ایجنٹ کھڑا کر دیتا ہے تا کہ وہ بولی کو بڑھاتا رہے، جس کی وجہ سے خریدار دھوکا کھا کر حقیقی دام سے زیادہ قیمت ادا کر دیتا ہے اور اس کا استحصال ہو جاتا ہے۔ ان احادیث سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ جو شخص بھی دھوکے کے ذریعے، بازار کے دام سے کم دام ادا کرتا ہے یا زیادہ لیتا ہے تو وہ رِبا الفضل میں ملوث ہوتا ہے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ یہاں قرض لینے اور دینے کی نہیں بلکہ خرید و فروخت کی بات ہو رہی ہے یعنی رِبا الفضل کا تعلق ربا النسیئہ کی طرح قرض کے لین دین سے نہیں بلکہ خرید و فروخت سے ہے۔

دوسری مثال

رِبا الفضل میں ملوث ہونے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی شخص کی سفارش کرنے کا سفارش کرنے والا معاوضہ وصول کرے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کے لیے سفارش کی اور اس سے کوئی تحفہ قبول کیا تو وہ رِبا کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں داخل ہو گیا۔''[18] اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص نیکی اور بھلائی کا کام رضائے الٰہی کے حصول کے لیے نہیں بلکہ دنیا کمانے کی در پردہ نیت سے کرے۔ اس قسم کی سفارش سے اس کا امکان ہے کہ ایک ایسے شخص کو فائدہ پہنچے جو کم مستحق ہے اور ایک ایسے شخص کو نقصان ہو جو زیادہ مستحق ہے۔

تیسری مثال

رِبا الفضل میں ملوث ہونے کا تیسرا طریقہ مال (اشیاء) کے بدلے مال کی تجارت (Barter) کرنے کا ہے۔ ایسے سودوں میں بیچی گئی یا خریدی گئی چیز کی قیمت کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ چناں چہ رسول اکرم ﷺ نے کسی ایسی معیشت میں جہاں روپے پیسے کا چلن ہو وہاں مال کے بدلے مال کی تجارت (Barter) کی حوصلہ شکنی فرمائی ہے اور اس بات کی

تاکید فرمائی ہے کہ بیچی جانے والی چیز کو نقد رقم کے عوض فروخت کیا جائے اور اس رقم سے ضرورت کی چیز خریدی جائے۔[19]

چوتھی مثال

رِبا الفضل میں ملوث ہونے کا چوتھا طریقہ وہ ہے، جس پر فقہاء نے زیادہ توجہ دی ہے اور جس کی وجہ سے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ گویا یہی رِبا الفضل ہے۔ کئی مستند احادیث میں تاکید کی گئی ہے کہ اگر ایک ہی جنس کی اشیاء کا تبادلہ کیا جائے، مثلاً سونے کا سونے سے یا چاندی کا چاندی سے یا روپے کا روپے سے، تو پھر یہ ضروری ہے دو شرطیں پوری کی جائیں۔ ایک یہ کہ یہ دونوں اشیاء مقدار یا وزن کے اعتبار سے برابر ہوں ''مثلا بمثل'' سواء بسواء'' اور دوسری یہ کہ تبادلہ ہاتھوں ہاتھ ہو یا دوسرے الفاظ میں فوراً بلا تاخیر ہو''یدا بید اور ولا تبیعو منھا غائبا بناجز''۔[20] لیکن اگر دونوں چیزیں اپنی جنس کے اعتبار سے مختلف ہوں (مثلاً روپے کا تبادلہ ڈالر سے ہو) تو پھر ان کے وزن یا مقدار کے مختلف ہونے میں کوئی حرج نہیں بشرطے کہ ان اشیاء کا تبادلہ ہاتھوں ہاتھ ہو یعنی فوراً بلا تاخیر کے۔ ان دونوں شرطوں کا مقصد سود کے چور دروازے کو بند کرنا ہے جسے فقہاء نے ''سد الذریعہ'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی شخص روپے کے بدلے روپے بیچتا ہے تو سو روپے کے بدلے سو ہی روپے لے سکتا ہے اور تبادلہ فوراً ہونا چاہیے۔ اگر تاخیر ہو تو بھی سو روپے کے بدلے سو ہی روپے لے سکتا ہے۔ ان احادیث کا ایک اور مطلب جو فقہاء نے سمجھا ہے وہ یہ کہ غیر ملکی سکّوں میں مستقبل کے سودے (Forward Transactions) کرنے کی ممانعت ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ روپے کے عوض ڈالر خریدتے ہیں تو سودا فوری (Spot) ہونا چاہیے، مستقبل (Future) کا نہیں ہوسکتا۔ یعنی آپ یہ نہیں کر سکتے کہ روپے ابھی دیں اور اس وقت طے کی گئی شرح سے ڈالر مستقبل میں لیں۔ یہ اس لیے کہ شرح کے بدل جانے سے دونوں میں سے کسی ایک پارٹی کے ساتھ ناانصافی ہوسکتی ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں ڈالر لیتے وقت جو شرح ہو اس کے حساب سے ڈالر لیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہیجنگ (Headging) بھی منع ہے، جو غیر ملکی سکّوں کی شرح میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ہونے والے نقصان سے بچنے کے لیے کی جاتی ہے۔

اس سوال کی طرف فقہاء کی توجہ کی ضرورت ہے۔ ہیجنگ (Hedging) کی اجازت نہ ہونے کے باعث درآمد اور برآمد کرنے والوں کو کافی نقصان ہوسکتا ہے۔ یعنی اگر کوئی تاجر جاپان سے کپڑا درآمد کرنا چاہتا ہے تو کپڑے کی قیمت ین (Yen) یا ڈالر میں ابھی سے طے ہوجائے گی لیکن روپے میں رقم ۳ مہینے کے بعد کپڑا وصول کرتے وقت ادا کرنی ہوگی۔ اگر ین یا ڈالر کی قیمت بڑھ گئی تو روپے زیادہ دینے ہوں گے اور اس طرح تاجر کو بہت نقصان ہوجائے گا۔ اس کے پاس اس وقت اتنی رقم نہیں کہ وہ ابھی سے ین (Yen) یا ڈالر خرید لے۔ اس لیے وہ مستقبل کا سودا کرنا چاہتا ہے کیا یہ جائز ہے؟ فقہا کا فتویٰ ابھی تک نفی میں ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت ضروری ہے کہ یا تو فقہاء مشکلات کے حل کے لیے کوئی شرعی حل بتائیں یا پھر اپنے فیصلوں پر شریعت کی روشنی میں نظر ثانی کریں۔

رِبا النسیئہ اور رِبا الفضل دونوں سورۂ بقرہ کی اس آیت کا مثنّیٰ ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور رِبا کو حرام "اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا" رِبا النسیئہ کا تعلق قرضوں اور سود سے ہے، جس کی حرمت اس آیت کے دوسرے حصے میں آئی ہے "وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا" رِبا الفضل کا تعلق تجارت سے ہے، جو اس آیت کے پہلے حصے میں ہے۔ تجارت کے حلال ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس میں ہر چیز حلال ہے۔ جیسا ظلم سود کے ذریعے ہوتا ہے ویسا ہی ظلم اشیاء کی خرید وفروخت اور مختلف ممالک کے سکّوں کے تبادلے سے بھی ہوسکتا ہے۔ رِبا الفضل اسی قسم کے سارے ظلم کو ختم کرنے کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے زمرے میں ہر وہ استحصال آتا ہے، جو اشیاء کی قیمتوں، ناپ تول اور معیار میں بے ایمانی اور سکّوں کی شرح میں اتار چڑھاؤ یا بے یقینی (غَرَر) کے ذریعے لاحق ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ فروخت کرنے والے اور خریدنے والے دونوں کو اُن اشیاء کے معیار، قیمت اور سپردگی کے وقت اور تاریخ کے بارے میں صحیح معلومات ہوں، جن کا وہ تبادلہ کرنے والے ہیں تاکہ تاجر اور خریدار دونوں کو استحصال سے بچایا جاسکے۔[۲۱]

جہاں ربا النسیئہ کی تعریف چند الفاظ میں کی جاسکتی ہے وہاں رِبا الفضل کی تشریح آسان نہیں کیوں کہ یہ مختلف قسم کے بے شمار تجارتی سودوں کا احاطہ کرتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "رسول اکرم ﷺ رِبا والی آیت کی مکمل تشریح کیے بغیر اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔" حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کی بنیاد پر

سود کے لیے جواز پیدا کرنے کی کوشش کرنا قطعی بے بنیاد ہے کیوں کہ ان کے اس قول کا تعلق ربا النسیئہ سے تھا ہی نہیں بلکہ رِبا الفضل سے تھا۔ انھوں نے یہ نہیں فرمایا کہ چوں کہ رِبا الفضل کی مکمل تشریح نہیں ہوئی ہے اس لیے تم سود بھی مزے سے کھا سکتے ہو، بلکہ یہ فرمایا کہ ایک مسلمان کو یہ چیز زیادہ زیب دیتی ہے کہ وہ صرف رِبا سے ہی نہ بچے بلکہ ریبہ سے بھی بچے۔ یعنی ہر اس ذریعۂ آمدنی سے بچے، جس کے بارے میں اسے یقین نہیں کہ وہ رِبا سے پاک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے رِبا الفضل میں ملوث ہونے کے تمام طریقے کیوں نہیں بتا دیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں تھا اور نہ ہی ممکن۔ تجارت اور سکّوں کے تبادلے میں ظلم اور استحصال کے طریقے مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس قدر بدلتے رہے ہیں کہ ان کا ۱۴ سو سال پہلے پوری طرح احاطہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ قرآن اور سنت نے وہ تمام اصول بتا دیئے ہیں جن کے ذریعے سے امت مسلمہ ہر زمانے میں اپنے حالات کی مناسبت سے اپنے لیے ایک تفصیلی لائحۂ عمل طے کر سکتی ہے۔ یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک دائمی چیلنج ہے کہ وہ قرآن اور سنت کی روشنی میں تجارت کرنے اور دولت کمانے کے مختلف طریقوں کا جائزہ لیتے رہیں تا کہ وہ ظلم و ناانصافی اور استحصال کے تمام راستے اور چور دروازے بند کر سکیں۔ اس طرح رِبا الفضل کا خاتمہ کرنا رِبا النسیئہ کے ختم کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اس کے لیے پختہ ارادے کے ساتھ پوری معیشت کی از سرِ نو تنظیم اور مکمل اصلاح کی ضرورت ہے تا کہ ظلم و استحصال کا مکمل خاتمہ کیا جا سکے اور عدل و انصاف کو یقینی بنایا جا سکے، جو قرآن کی رو سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد عظیم ہے (سورۂ حدید، آیت: ۲۵)۔

حرف آخر

سود کھانا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کے مترادف ہے، اس شدت کے ساتھ سود کے خلاف اعلان جنگ کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا اقتصادی نظام چاہتا ہے، جس میں ہر قسم کے ظلم اور استحصال کا خاتمہ ہو، خاص طور پر ایسی ناانصافی کا جس کے ذریعے سرمایہ لگانے والے کو کوئی کام کیے بغیر یا نقصان میں حصہ لیے بغیر پہلے سے طے کی ہوئی ایک مثبت شرح کی مناسبت سے نفع کی ضمانت دی گئی ہو جب کہ اس کے برعکس تاجر کو اس کی انتظامی کارکردگی اور سخت محنت کے باوجود کسی مثبت فائدے کی ضمانت نہیں دی گئی۔ اسے جہاں نفع ہو سکتا

ہے وہاں نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سرمایہ دار اور تاجر کے درمیان انصاف کے ساتھ معاملہ ہو۔ رہا سوال تاجر کا سرمایہ دار کو دھوکہ دینے کا تو اس کے سد باب کے لیے ہر زمانے میں مختلف تدبیریں اختیار کی گئی ہیں اور اب بھی کی جاسکتی ہیں۔ یہ دلیل بالکل بے بنیاد ہے کہ جب معاشرہ مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے گا تب ہم اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی کریں گے۔ دنیا میں ہمیشہ جہاں ایمان دار لوگ رہے ہیں وہاں دھوکہ باز لوگ بھی رہے ہیں اور عوام اور حکومتوں نے مل کر بے ایمانی کو ختم کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔

اسلام میں عدل و انصاف اور بھائی چارہ پر جو زور ہے۔ اسے اگر سامنے رکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں سود کی حرمت کیوں ہے۔ سود کا جواز صرف اسی صورت میں پیدا ہوسکتا ہے جب ہم اسلام کے مقاصد اور اس کی تعلیمات، خاص طور سے اس میں عدل وانصاف پر زور اور آمدنی اور دولت کی عادلانہ تقسیم کے مقصد کو نظر انداز کردیں۔ اگر ہم سود کی حرمت کو ایک ایسی جزئی قدر سمجھیں، جس کا اسلام کے مجموعی مقاصد اور تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں تب ہی ہم اس کی حرمت اور اس حرمت کے مضمرات کو سمجھنے سے قاصر رہ سکتے ہیں۔

حواشی باب اوّل

(۱) عن جابر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: "لعن رسول اللّٰہ ﷺ اکل الربا و موکله، و کاتبه و شاهدیه" و قال: "هم سواء." (رواہ مسلم والترمذی واحمد)

"حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سودی معاہدہ کو لکھنے والے اور اس معاہدے کے دونوں گواہوں پر لعنت بھیجی ہے اور اس لعنت میں یہ سب برابر برابر شریک ہیں۔"

(۲) عن عبد اللّٰہ بن حنظلة، غسیل الملائکة، قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: درهم رِبا یاکله الرجل و هو یعلم، اشد من ستة و ثلاثین زنیة (رواہ احمد و دار قطنی) و عن ابی هریرة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: الربا سبعون جزء ا، ایسرها ان ینکح الرجل امهٗ. (رواہ ابن ماجہ، والبیہقی فی شعب الایمان)

"حضرت عبداللہ بن حنظلہ جن کی شہادت کے بعد فرشتوں نے انہیں غسل دیا، روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک درہم ربا بھی جانتے بوجھتے لینا ۳۶ بار زنا کرنے سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سود کے ۷۰ حصے ہیں اور ان میں سے سب سے کم سنگین ایک شخص کا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنا ہے۔"

(۳) لفظ ربا کے معنی کے لیے عربی زبان کی مشہور و معروف لغات سے رجوع فرمائیں، مثلاً ابن منظور کی "لسان العرب" الزبیدی کی "تاج العروس" اور راغب الاصفہانی کی "المفردات فی غریب القرآن۔" یہی معنی ہمیں قرآن کی تمام تفاسیر میں بھی ملتے ہیں۔

(۴) عن انس بن مالکؓ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ "اذا اقرض احدکم قرضاً، فاهدی الیه طبقاً، فلا یقبلها او حمله علی دابة فلا یرکبها، إلا ان یکون جری بینه و بینه قبل ذلک. (سنن البیہقی)

"حضرت انس بن مالکؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی کو قرض دے اور قرض لینے والا قرض کی رقم کے علاوہ اسے ایک پلیٹ کھانا ہی دے تو وہ اسے قبول نہ

کرے اور اپنی سواری پر سواری کی پیش کش کرے تو یہ بھی قبول نہ کرے الا یہ کہ اس قسم کا لین دین ان دونوں کے درمیان قرض کے بغیر بھی عام ہو۔"

و عنه ایضاً عن النبی ﷺ قال: اذا اقرض الرجل فلا یأ خذ هدیة۔

(رواہ البخاری فی تاریخہ)

"حضرت انس بن مالکؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قرض دے تو اس سے کوئی ہدیہ قبول نہ کرے۔"

(۵) **اجمع المسلمون، نقلاً عن نبیهم، ان اشتراط الزیادة فی السلف ربا، و لو کان قبضة من علف، کما قال ابن مسعودؓ، اوحبة واحدة۔**

(تفسیر القرطبی، طبعۃ ثالثۃ، ۱۹۶۷م، دار الکتاب العربی، القاہرہ، ج ۳، ص: ۲۴۱)

"تفسیر قرطبی کی رو سے مسلمانوں کا ان کے نبی ﷺ کی روایات کی بنیاد پر اجماع ہے کہ قرض کے لیے یہ شرط کہ اس سے زیادہ رقم ادا کی جائے گی رِبا ہے خواہ وہ زیادتی مٹھی بھر چارہ ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے، یا اناج کا ایک دانہ۔" ابن منظور کی لسان العرب کی رُو سے "ہر وہ قرض حرام ہے جس میں قرض کی رقم سے زیادہ رقم یا کوئی خدمت حاصل کی جائے۔"

(۶) **الحرام کل قرض یؤخذ به اکثر منه، او تجربه منفعة** (دیکھیے لفظ "رِبا" ابن منظور کی لسان العرب میں۔ اس کے علاوہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۵ کی تفسیر کے لیے فخر الدین رازی کی تفسیر الکبیر اور ابوبکر الجصاص کی احکام القرآن اور ابن عربی کی احکام القرآن سے بھی رجوع فرمائیں۔

(۷) دیکھیے الجزیری، ج ۲ ص ۲۴۵

(۸) دیکھیے السنہوری، ۱۹۵۳، ج ۳، ص ۲۴۱-۲۴۶، اور القرضاوی، ۱۹۹۴، ص ۱۲۹-۱۴۲۔ اس کے علاوہ دیکھیے عبدالحمید الغزالی کی کتاب ان سب فتووں کے لیے جو ۱۹۰۰ء سے ۱۹۸۹ء تک سود کی حرمت کے بارے میں دیئے گئے ہیں۔

(۹) ابوزہرہ، ۱۹۷۰، ص ۵۳-۵۴

(۱۰) یوڈووِچ (Yudovitch)، ۱۹۷۰، ص ۸۶

(۱۱) الجزیری، ج ۲، ص ۲۴۵

(۱۲) **الربا فی اللغة هو الزیادة والمراد به فی الأیة کل زیاده لم یقابلها عوض۔**

ابن العربی، احکام القرآن، ۱۹۶۷، ص: ۲۴۲۔

"رِبا کے لغوی معنی زیادتی ہیں اور اس سے مراد ہر وہ زیادتی ہے جس کے مقابلے میں کوئی عوض نہیں۔"

(۱۳) **الربا سبعون جزءً ا، ایَسَرُها ان ینکح الرجل امهٗ۔** (رواہ ابن ماجہ، والبیہقی فی شعب الایمان)

"رِبا کے ۷۰ حصے ہیں اور ان میں سے سب سے کم سنگین ایک شخص کا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنا ہے۔"

(۱۴) ''دع ما یریبک الی ھالا یریبک'' ''جس چیز کے بارے میں بھی تمہیں شک ہو اس پر اس چیز کو ترجیح دو جس کے بارے میں تمہیں کوئی شک نہیں۔'' تفسیر ابن کثیر میں دیکھیے سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۷۵ کی تفسیر۔

(۱۵) ان آخر ما نزلت آیة الربا، و ان رسول اللّٰہ ﷺ قبض ولم یفسرھا لنا، فدعوا الربا والریبه۔ (رواہ ابن ماجہ والدارمی)

''سب سے آخر میں رِبا والی آیت نازل ہوئی اور اس کی مکمل تفسیر کرنے سے پہلے رسول اکرم ﷺ رحلت فرما گئے۔ پس تم رِبا بھی چھوڑ دو اور ریبہ بھی، ہر وہ چیز جس کے حلال ہونے کے بارے میں تمھیں شک ہو۔''

(۱۶) عن انس عن جابرؓ عن النبی ﷺ انه قال: ''غبن المسترسل رِبا۔''

کنز العمال، ج ۴، ص ۴۲، رقم ۳۹۵، رواہ البیہقی والسیوطی فی الجامع الصغیر تحت کلمۂ غبن۔

''مسترسل کو دھوکہ دینا بھی رِبا ہے۔''

(۱۷) عن عبد اللّٰہ بن ابی اوفی عن النبی ﷺ انه قال: ''الناجش آکل رِبا ملعون'' ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، کتاب البیوع، باب النجش، والسیوطی، الجامع الصغیر، تحت کلمة نجش۔

''حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ناجش لعنت زدہ رِبا کھانے والا ہے۔''

(۱۸) عن ابی امامة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه عن النبی ﷺ انه قال: ''من شفع لاخیه شفاعة، فاھدی له ھدیة فقبلھا، فقد اتی بابا عظیما من ابواب الربا۔

(رواہ احمد وابوداؤد دیکھیے بلوغ المرام، کتاب البیوع، باب الربا)

''حضرت اُمامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے بھائی کے حق میں سفارش کرنے کے بدلے ہدیہ قبول کرتا ہے تو وہ رِبا کے دروازوں میں سے ایک بہت بڑے دروازے میں داخل ہو گیا۔''

(۱۹) عن ابی سعید و ابی ھریرة رضی اللّٰہ تعالٰی عنھما ان رسول اللّٰہ ﷺ استعمل رجلا علی خیبر، فجائه بتمر جنیب، فقال: ''اکل تمر خیبر ھکذا؟'' قال: لا، واللّٰہ یا رسول اللّٰہ! انا لنأخذ الصاع من ھذا بالصاعین، والصاعین بالثلاث، فقال: ''لا تعمل! بع الجمع بالدراھم جنیبا، و قال؛ ''وفی المیزان مثل ذلک'' البخاری، کتاب البیوع، باب اذا اراد بیع تمر بتمر خیر منه، (مسلم والنسائی)

''حضرت ابو سعیدؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے خیبر میں ایک شخص کو کھجوریں لانے کے لیے بھیجا تو وہ جنیب قسم کی کھجوریں لے آیا۔ اس پر آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ نہیں یا رسول اللہ ﷺ ہم ایک صاع کھجور کے عوض دو صاع اور دو صاع کھجوروں کے عوض تین صاع لیتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو۔ تمام کھجوروں کو درہموں کے عوض بیچوں اور ان درہموں سے جنیب کھجوریں خریدو۔''

(۲۰) اس موضوع کی کئی احادیث ہیں جن کا یہاں نقل کرنا ممکن نہیں۔ ان احادیث کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب ''نحو نظام نقدی عادل'' (Towards a Just Monetary System) ۱۹۸۵ء ص ۲۳۸-۲۴۰، ان احادیث میں جن اشیاء کا ذکر آیا ہے وہ ہیں: سونے کے بدلے سونا، چاندی کے بدلے چاندی، گیہوں کے بدلے گیہوں، جو کے بدلے جو، کھجور کے بدلے کھجور اور نمک کے بدلے نمک۔

(۲۱) شریعت نے کئی قسم کے سودوں سے منع کیا ہے تاکہ تاجر اور خریدار دونوں میں سے کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند سودے یہ ہیں: نجش، غبن المسترسل، بیع الحاضر للباری، تلقی الرکبان، غرر، محاقلہ، منابذہ، ملامسہ، اور مزابنہ۔ دیکھیے الجزیری، ج ۲، ص ۲۷۳-۲۷۸ اور ۲۸۳-۲۹۱

باب دوم

سود کی حرمت کیوں؟

پچھلے مقالے میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ قرآن نے سود خوری کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ کے برابر قرار دیا ہے اور رسول اکرم ﷺ نے اسے چھتیس بار زنا کرنے یا اپنی ماں کے ساتھ اسی قسم کی بے حرمتی کرنے سے بھی زیادہ برا قرار دیا ہے۔ اور قرضے کی شرط کے طور پر چھوٹے سے چھوٹا معاوضہ یا تحفہ لینے سے بھی منع فرمایا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام نے سود کی حرمت کے بارے میں اتنا سخت لہجہ کیوں اختیار کیا ہے جب کہ اتنی سختی کسی اور جرم کے بارے میں اختیار نہیں کی گئی ہے۔ اس مقالے میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

سود کی حرمت دوسرے مذاہب میں

یہاں یہ بات بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب نہیں ہے جس میں سود کی حرمت اس قدر سختی سے آئی ہو۔ ہندو مت، یہودیت اور عیسائیت میں بھی سود کی سختی سے مذمت کی گئی ہے۔[(۱)] تلمود نے، جو یہودیوں کی مقدس کتاب ہے، سود لینے والے کو جرم کے اعتبار سے قاتل کے برابر قرار دیا ہے اور مشنا نے، جو ان کی فقہ کی کتاب ہے، سود لینے والے کو عدالت میں گواہی دینے کے لیے نا اہل قرار دیا ہے۔[(۲)] عیسائیوں کی مقدس کتاب بائبل نے سود لینے والے کو ظالم قرار دیا ہے۔[(۳)] اور ان کی تیسری لیٹرن کونسل (Third Lateran Council) نے، جو ۱۱۷۹ء میں منعقد ہوئی تھی، سود لینے والوں کو عیسائیت کے طریقہ پر دفن کرنے کی بھی ممانعت کی تھی۔[(۴)] یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عیسائیت نے زیادہ شرح سود (Usury) اور کم شرح سود (Interest) کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا تھا، دونوں یکساں حرام تھے۔[(۵)] اس وجہ سے یہ سوال اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ آخر سود کے خلاف حکم میں تمام مذاہب میں اتنی سختی کیوں۔

ہے؟ کیا اس کی کوئی معقول وجہ ہے؟ اور اگر کوئی وجہ ہے تو کیا وہ وجہ موجودہ زمانے سے بھی اتنی ہی مناسبت رکھتی ہے جتنی قرون اولیٰ میں رکھتی تھی؟

کیا صرف غریب لوگ قرضے لیتے تھے؟

جو لوگ سود کی حرمت کے خلاف ہیں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ان سب مذاہب میں سود کھانے کی ممانعت اس لیے تھی کہ اس سے غریبوں کے ساتھ ظلم ہوتا تھا۔ وہ اپنی معاشی مشکلات کی بنا پر قرض لینے کے لیے مجبور ہوتے تھے اور بہت اونچی شرح سود کی بنا پر ان کی کمر ٹوٹتی تھی، اور یہی نہیں کہ غربت ان پر اور زیادہ مسلط ہو جاتی تھی بلکہ وہ سرمایہ دار کے غلام بن جاتے تھے۔ اس دلیل کی بنا پر وہ اصرار کرتے ہیں کہ جدید دور کے بینک اس قسم کا استحصال نہیں کرتے۔

اسلامی تاریخ، جیسا ہم پچھلے مقالے میں بتا چکے ہیں، اس مفروضے کی کسی صورت سے تصدیق نہیں کرتی ہے۔ سود کی حمایت کرنے والے تاریخ کی اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسلام نے غریبوں کی حالت بہتر بنانے اور ان کو سودی قرضے کے شکنجے سے بچانے کے لیے کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا تھا۔ رسول اکرم ﷺ کی زندگی کے آخری دور میں جب سود کی حرمت کا نفاذ سختی سے ہوا اس وقت اسلام کا فلاحی نظام پوری طرح قائم ہو چکا تھا اور غریبوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے قرض لے کر سرمایہ دار کے شکنجے میں پھنسنے کی کوئی حاجت نہیں پیش آتی تھی۔ ان کی ضروریات صاحبِ ثروت لوگوں کے زکوۃ، صدقات اور قرض حسن سے پوری ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بیت المال بھی لوگوں کی خبر گیری اور حاجت روائی کے لیے موجود تھا۔

یہاں شاید آپ یہ سوال اٹھائیں کہ اگر غریب لوگ قرض نہیں لیتے تھے تو پھر کون لیتا تھا۔ قرض تو تاجر حضرات لیتے تھے، جو اپنے معاشرے کی فاضل پیداوار کی برآمد اور ضروریاتِ زندگی کی درآمد کے لیے دور دراز کے سفر قافلوں کی صورت میں کرتے تھے۔ ان سفروں میں طویل مدت صرف ہوتی تھی اور کافی سرمایہ درکار ہوتا تھا۔ تاجر کو نفع بھی ہو سکتا تھا اور نقصان بھی۔ اسلام کے نظام عدل میں یہ چیز قابل قبول نہیں تھی کہ سرمایہ دار، جس نے صرف سرمایہ فراہم کیا اور اس کے علاوہ کوئی تگ و دو نہیں کی، اس کو تو ہر حالت میں ایک طے شدہ شرح سے سود ملے اور تاجر کو اس کی تمام تگ و دو کے باوجود پورا کا پورا نقصان برداشت کرنا پڑے۔ اسلام نے اس لیے سود کو ختم کیا اور سرمایہ دار کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں سود کی حرمت اس لیے نہیں آئی کہ اس سے غریبوں

کا استحصال ہوتا تھا باوجود اس کے کہ اسلامی نظام میں غریبوں کے ساتھ عدل وانصاف کرنے اور ان کی حالت بہتر بنانے کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ قرآن تو عدل وانصاف کا یہ تقاضا سمجھتا ہے کہ جن لوگوں کا استحصال کیا گیا ہے ان کی حالت بہتر بنا کر انہیں قیادت کے مناصب تک پہنچایا جائے۔[۲] غریبوں کی امداد کے لیے اسلام نے اپنا ایک مخصوص فلاحی نظام بنایا ہے، جس کی تفصیل اسلام کے اقتصادی نظام سے متعلق کئی کتابوں میں ملتی ہے۔ لہٰذا اس تفصیل میں یہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تو صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اسلام تو غریبوں کی امداد سے بھی آگے بڑھ کر ایک ایسا نظام دیتا ہے، جس کے ذریعے سے زندگی کے تمام شعبوں میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ تاکہ فلاح عام کی بنیادیں مضبوط ہوں۔ اسی بات کو قرآن نے انبیاء کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا ہے۔ (سورۃ الحدید: ۲۵)

سود اور فلاح انسانی کا حصول

اسلام میں عدل کا جو وسیع اور جامع تصور ہے اس کے تقاضے صرف غریبوں کے استحصال کو ختم کرنے اور تاجر اور سرمایہ دار کے درمیان عدل کے قیام سے پورے نہیں ہوتے۔ عدل کا حصول صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے، جب وہ سارے وسائل جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے بہ طور امانت فراہم کیے ہیں اس طرح استعمال کیے جائیں کہ سارے انسانوں کی بہبودی کے تمام مسلمہ تقاضے پورے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہم ان وسائل کو اس خوبی کے ساتھ استعمال کریں کہ مناسب رفتار سے اقتصادی ترقی ہو اور کم از کم مندرجہ ذیل چار مقاصد کا زیادہ سے زیادہ ایک متوازن (Optimum) طریقہ پر حصول ہو:

(۱) تمام انسانوں کی ضروریات زندگی پوری ہوں۔

(۲) تمام لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کی مناسبت سے قابل احترام ذریعہ معاش حاصل ہو، تاکہ اپنی ضروریات زندگی اپنی محنت سے پوری کرسکیں۔

(۳) آمدنی اور دولت کی عادلانہ تقسیم ہو۔

(۴) مالی اور اقتصادی استحکام ہو۔

یہ مقاصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتے ہیں جب کہ پورا نظام زندگی اور خصوصاً اقتصادی نظام اور اس کی حکمت عملی ان مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ ایسی حکمت عملی کا ایک اہم سنگ بنیاد اللہ تعالیٰ نے سود کی حرمت کو قرار دیا ہے اور اس لیے تمام ادیان نے اس کی سختی سے

مذمت کی ہے۔ اس مقالے کا بنیادی مقصد مختصر طور پر یہی بتانا ہے کہ سود کی بنیاد پر قائم ہونے والا مالی نظام کس طرح ان مقاصد کے بدرجۂ اتم حصول میں مانع ہوتا ہے اور سود کی حرمت کے دائرے میں معاشی نظام کی تنظیم نو اور قرضوں پر انحصار میں کمی سے کس طرح ان مقاصد کے حصول میں زیادہ موثر طریقے پر مدد مل سکتی ہے۔(۷)

(ا) ضروریات زندگی کی تکمیل

سودی نظام میں قرضے عموماً انھیں لوگوں کو ملتے ہیں جو کوئی قابل قبول اثاثہ (Collateral) بینک کو ضمانت کے طور پر فراہم کرنے کے علاوہ اس کا بھی بینک کو اطمینان دلا سکیں کہ ان کے پاس نقد کا بہاؤ (Cash Flow) اتنا ہے کہ وہ اصل رقم بمع سود کے ادا کر سکیں گے۔ قرض کی رقم کس مقصد کے لیے استعمال ہوگی اس کی طرف توجہ تو دی جاتی ہے مگر اتنی نہیں جتنی دی جانی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ضمانت اور نقد کا بہاؤ دونوں قرض کی ادائی کے لیے ناگزیر ہیں لیکن ان دونوں کی طرف ایک حد سے زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے قرض کی رقم کے حقیقی استعمال کی طرف توجہ کم ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے قرض کے لیے میسر وسائل زیادہ تر مال داروں کو مل جاتے ہیں۔ جو ضمانت بھی فراہم کر سکتے ہیں اور ان کے پاس نقد کا بہاؤ بھی خاطر خواہ ہوتا ہے، یا پھر حکومتوں کو ملتے ہیں، جن کے بارے میں عام طور پر یہ توقع ہے کہ وہ کنگال نہیں ہوں گی اور قرضے کو بمع سود کے ادا کر دیں گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مال دار لوگ اور حکومتیں کس مقصد کے لیے قرضے لیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مال دار لوگ جو قرضے لیتے ہیں وہ ان کی استہلاکی اغراض (Consumption) کے لیے ہوتے ہیں یا پھر سرمایہ کاری کے لیے۔ جو قرضے وہ استہلاک کے لیے لیتے ہیں وہ ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ وہ اشیائے تعیش کی خریداری کے لیے ہوتے ہیں۔ اور جو قرضے وہ سرمایہ کاری (Invesment) کے لیے لیتے ہیں وہ بھی سب کے سب پیداواری اغراض کے لیے نہیں ہوتے بلکہ سٹے اور اسی طرح کی دوسری غیر پیداواری اغراض کے لیے بھی ہوتے ہیں۔ اور حکومتیں بھی جہاں ترقیاتی منصوبوں اور عوام کی بہبود کے لیے قرضے لیتی ہیں وہاں وہ غیر ضروری اسلحہ اور غیر پیداواری منصوبوں کے لیے بھی لیتی ہیں۔ اس طرح جو وسائل پورے معاشرے کے پاس میسر ہیں ان پر ضرورت سے زیادہ بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ چوں کہ وسائل پہلے ہی ناکافی ہیں اس لیے قرضوں کی وجہ سے مال دار لوگوں اور حکومتوں میں اپنی وسعت

سے زیادہ خرچ کرنے (Living beyond means) کا جو رجحان پیدا ہوتا ہے اس سے ضروریات زندگی پوری کرنے اور پیداواری سرمایہ کاری کے لیے وسائل میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر کس پر پڑتا ہے؟

مال دار لوگ تو اپنی ضروریات بہر صورت پوری کر لیتے ہیں لیکن غریب لوگ پس جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ جیسے رئیس ممالک بھی اپنی شدید خواہش اور بے پناہ وسائل کے باوجود غریب عوام کی تمام بنیادی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ پاکستان جیسے غریب مسلمان ممالک اگر امریکہ جتنی دولت پیدا کرنے کے بعد بھی عوام کی ضرورتیں پوری کرنے میں ناکام ہو جائیں تو پھر وہ اسلام کے فلاح عام کے حصول کے خواب کو کب شرمندہ تعبیر بنا سکیں گے؟

یہ ایک مفروضہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ سودی قرضوں کے آسانی سے میسر ہونے کے باعث پاکستان میں مختلف حکومتوں نے قرضوں پر اس قدر انحصار کیا کہ بقول صدر مشرف حکومت کے پورے بجٹ کا تقریباً ۶۶ فی صد صرف سود اور اصل کی ادائی (Debt Servicing) پر صرف ہونے لگا۔[۸] چناں چہ دفاع اور انتظامی امور (Administration) پر خرچ کے بعد حکومت کے پاس تعلیم، سڑکوں کی تعمیر اور مرمت، صحت، معاشی ترقی اور دیگر فلاحِ عام کے منصوبوں کے لیے بہت کم وسائل بچنے لگے۔ لہٰذا ہمیں مزید قرضے لینے پڑتے ہیں۔ قرض کے بوجھ کے اس قدر بڑھ جانے کی وجہ سے جہاں ہم غربت دور کرنے، معاشی ناہمواریاں کم کرنے اور ملک کی معاشی ترقی کی رفتار بڑھانے میں ناکام رہے ہیں وہاں ہم امیر ممالک کے شکنجے میں روز بہ روز زیادہ کستے جاتے ہیں اور ہمیں غلاموں کی طرح ان کی خواہشات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صدر مشرف کے دور میں قرض کے بوجھ میں کچھ کمی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں ہماری اپنی کوشش سے زیادہ بڑا دخل ہمارا مسئلہ افغانستان میں امریکہ کا ساتھ دینا تھا، جس کی وجہ سے ہمیں مالی امداد میسر ہوئی اور قرض کی ادائی کی مدت میں بھی توسیع (Rescheduling) ہوئی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں شرح سود میں کمی کی وجہ سے ہمیں کافی فائدہ ہوا ہے۔ لیکن جب شرح سود بڑھے گی اور قرض کی ادائی کی مدت میں توسیع کا اثر ختم ہوگا اور ہمیں قرض ادا کرنا پڑے گا، تو پھر مستقبل کی حکومتوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، خاص طور سے اگر ہم نے قرض پر اپنا انحصار اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بہت کم نہ کر دیا۔

مشرقی ایشیا کے ممالک کی تیز تر ترقی کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ ان کے امیر لوگوں نے نسبتاً سادہ زندگی کو اپنایا، اور ان کی حکومتوں نے اپنے قومی وسائل پر زیادہ

سے زیادہ اعتماد کیا اور قرضے کم سے کم لیے۔ اس کی وجہ سے ان پر قرضوں کا بوجھ بہت کم پڑا اور ترقی کے لیے جو منصوبے ضروری ہیں ان پر وہ زیادہ خرچ کر سکے۔ اگر پاکستان میں حکومتیں اسلام کی دی ہوئی تعلیمات پر عمل کرتیں تو وہ مجبور ہوتیں کہ اپنے ٹیکس کے نظام کو بہتر بنائیں اور غیر ضروری منصوبوں پر خرچ کم کریں۔ لیکن یہ دونوں کام نہیں کیے گئے کیوں کہ قرضے لے کر خرچ کرنا ٹیکس کے نظام کی اصلاح کرنے کی بہ نسبت آسان تھا۔ جن غیر ضروری منصوبوں پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی گئیں اب ان کو اونے پونے داموں پر نجی شعبے کو بیچا جا رہا ہے۔ اس عمل سے تھوڑے بہت آنسو پچھ سکتے ہیں اگر اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ جو رقم اس طرح وصول ہوگی اسے قرض کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے ہی استعمال کیا جائے۔

(۲) روزگار کے مواقع

سودی نظام افراد اور حکومتوں میں اپنی وسعت سے زیادہ خرچ کرنے کا جو رجحان پیدا کرتا ہے اس کی وجہ سے دنیا کے تمام ممالک کی بچتوں (Saving) میں کمی واقع ہوئی ہے۔ پچھلی صدی کے آخری چوتھائی حصے میں دنیا کے تمام ممالک میں مجموعی پیداوار سے گھریلو بچت کا تناسب ۱۹۷۱ء میں ۲۶۰۲ سے گھٹ کر ۱۹۹۸ء میں ۲۲۰۳ فی صد ہو گیا۔ صنعتی ممالک کی بچتیں ۲۳۰۶ فی صد سے کم ہو کر ۲۱۰۶ فی صد ہو گئیں اور ترقی پذیر ممالک میں، جن کو افراط زر اور قرضوں کی ادائی میں کسی نمایاں اضافے کے بغیر ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے بچتوں کو بڑھانے کی شدید ضرورت ہے، وہاں بھی اس عرصے میں بچتیں ۳۴۰۲ فی صد سے کم ہو کر ۲۶۰۰ فی صد رہ گئیں۔[۹] بچت میں اس قدر کمی کی مختلف وجوہات میں جن میں سے ایک بہت بڑی وجہ سرکاری اور نجی شعبوں کے غیر پیداواری اخراجات میں معتد بہ اضافہ ہے، جن کو سودی نظام میں فروغ ملتا ہے۔

اس کی وجہ سے حقیقی شرح سود (Real rate of Interest) میں اضافہ اور مجموعی سرمایہ کاری میں کمی ہوئی ہے۔ اس چیز نے دوسری سماجی، اقتصادی اور سیاسی رکاوٹوں (Structural Rigidities) کے ساتھ مل کر روزگار کے مواقع کو حسب ضرورت شرح سے بڑھنے نہیں دیا ہے۔ اس طرح دنیا کے تمام ممالک میں، چاہے وہ امیر ہوں یا غریب، بے روزگاری ایک ناقابل حل مسئلہ بن گئی ہے۔ بے روزگاری کی اوسط شرح یورپی یونین میں ۱۹۹۹ء میں ۹۰۲ فی صد تھی جو ۷۳-۱۹۷۱ کی ۲۰۹ اوسط فی صد شرح کے مقابلہ میں تقریباً تین گنا زیادہ ہے۔[۱۰] مستقبل قریب

میں ان ملکوں میں بے روزگاری کی شرح میں کسی نمایاں کمی کے ہونے کی کوئی توقع نہیں کیوں کہ ان ممالک میں اقتصادی ترقی کی حقیقی شرح (Real rate of Economic Growth) مستقل طور پر اس شرح سے کم ہوگئی ہے جو بے روزگاری کم کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ تشویش ناک بات نوجوانوں میں بے روزگاری کی بڑھتی ہوئی شرح ہے، جس سے ان کی انا مجروح ہوتی ہے، مستقبل پر اعتماد کم زور ہوتا ہے، معاشرے سے نفرت بڑھتی ہے اور ان کی صلاحیتوں اور پیداواری استطاعت کو گھن لگتا ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ امریکہ میں گھریلو بچت کے پست ہی نہیں بلکہ منفی ہونے کے باوجود معاشی ترقی تیز اور بے روزگاری بہت کم کیوں ہے؟ اس کی بہت سی وجوہات ہیں، جن میں سے ایک بہت بڑی وجہ امریکہ میں بیرونی بچتوں کا بہاؤ (Inflow) ہے۔ اس کی وجہ سے سرمایہ کاری میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔[11] اگر کسی وجہ سے یہ سرمایہ واپس جانا شروع ہوجائے یا اس کے اندرونی بہاؤ میں کمی ہوجائے تو پھر اقتصادی ترقی اور روزگار کے مواقع کو برقرار رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ اگر اس کی وجہ سے ڈالر کے (Exchange Rate) میں نمایاں کمی واقع ہو اور دنیا میں ڈالر پر اعتماد کو ٹھیس پہنچے تو دنیا کے مالی نظام (Financial System) میں بھی ایک شدید بحران پیدا ہوسکتا ہے جیسا کہ ۱۹۷۱ میں ڈالر کی قیمت میں کمی (Devaluation) سے پہلے اور بعد میں ہوا تھا۔

سٹے اور غیر ضروری اخراجات میں کمی اور بچت میں اضافہ ہو تو قومی اقتصاد کو کافی مدد مل سکتی ہے لیکن ایسا اس حالت میں ممکن نہیں جب سرکاری اور نجی شعبوں میں اپنے وسائل سے بڑھ کر غیر پیداواری اخراجات کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہو۔ سود کی بنیاد پر قائم مالیاتی نظام غیر پیداواری مقاصد کے لیے قرضوں کی آسان فراہمی کے ذریعے ایسے ہی طرز زندگی کو ممکن بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر بینکوں کو سرمایہ کاری میں ہونے والے نفع اور نقصان دونوں میں شریک کیا جائے اور قرضے صرف حقیقی سامان اور خدمات (Real Goods and Services) کی پیداوار کے لیے دیے جائیں جو اسلامی نظام یقینی بناتا ہے، تو اس کا اثر صرف یہی نہیں ہوگا کہ بینک قرضے دینے میں زیادہ محتاط ہوجائیں گے۔ بلکہ یہ بھی کہ قرضوں میں اضافہ معیشت میں ترقی کے تناسب سے ہوگا۔ غیر پیداواری اور سٹے کی بنیاد پر ہونے والے اخراجات بتدریج کم ہوجائیں گے اور پیداواری سرمایہ کاری اور ضروریات زندگی

کی تکمیل کے لیے زیادہ وسائل مہیا ہوں گے۔ اس سے ترقی کی رفتار تیز ہوگی، روزگار کے مواقع میں اضافہ ہوگا اور بے روزگاری میں کمی واقع ہوگی۔

(۳) عادلانہ تقسیم دولت

سود کی بنیاد پر قائم روایتی مالیاتی نظام میں مالی وسائل کی غیر عادلانہ تقسیم کو اب بڑے پیمانے پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ آرنی بگسٹن (Arne Bigsten) کے مطابق ''سرمائے کی تقسیم زمین کی تقسیم سے بھی زیادہ غیر مساوی ہے'' اور ''بینکاری کا نظام سرمائے کی غیر مساوی تقسیم کو اور بھی مستحکم کرتا ہے۔''(۱۲) اس کی بڑی وجہ وہی ہے جو پہلے بتائی جا چکی ہے یعنی یہ کہ سودی بنیاد پر قائم مالیاتی نظام ادائی کی ضمانت (Collateral) پر زیادہ انحصار کرتا ہے اور اس کی نظر منصوبے کی افادیت یا قرض پر لیے جانے والے سرمائے کے استعمال پر اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ ہونی چاہیے۔ چناں چہ باوجود اس کے کہ بینکوں میں رکھی جانے والی بچتیں معاشرے کے بے شمار افراد سے وصول ہوتی ہیں، ان کا فائدہ صرف مال دار لوگوں کو پہنچتا ہے۔ جیسا کہ میشان (Mishan) نے بجا طور پر کہا ہے: ''چوں کہ دولت کی تقسیم میں بہت زیادہ فرق ہے۔ قرض دینے والے کے لیے یہ معقول نہ ہوگا کہ وہ معاشرے کے مال دار افراد کے بجائے غریب افراد کو بھی قرض دینے کے لیے تیار ہو یا وہ دونوں کو ایک جیسی شرائط پر قرض دے۔''(۱۳) امریکہ کے بڑے بینکوں میں سے ایک بینک، مارگن گارنٹی ٹرسٹ کمپنی (Morgan Guarantee Trust Company)، نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بینکاری کا نظام ''چھوٹی پختہ کار کمپنیوں یا جرأت مند اختراعی سرمایہ کاروں (Venture Capitalists) کو سرمایہ فراہم کرنے سے قاصر رہا ہے'' اور ''باوجود اس کے کہ ان بینکوں کے پاس وافر سرمایہ ہوتا ہے، وہ زیادہ مال دار اور وافر نقد رکھنے والی کمپنیوں کے علاوہ کسی کو قابل قبول شرح سود پر سرمایہ مہیا کرنے کو تیار نہیں(۱۴)۔''

اس کے مقابلے میں نفع اور نقصان میں شراکت عدل کے حصول کے لیے زیادہ سازگار ماحول مہیا کرتی ہے۔ اس کے تحت سرمایہ فراہم کرنے والا اس بات کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ منصوبے کی افادیت کو زیادہ اہمیت دے۔ اس طرح غریب اور متوسط طبقے کے اہل تاجروں کے لیے بھی اس کا امکان ہوگا کہ اگر ان کے پاس ایک نفع بخش منصوبہ ہے، ان میں مطلوبہ انتظامی صلاحیت ہے، اور وہ ایمان داری اور دیانت داری کے معیار پر اپنے معاشرے میں اچھی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں تو اپنے منصوبے کو بہ روئے کار لانے کے لیے وہ ضروری سرمایہ حاصل کر سکیں۔

اس سے معاشرہ غریب اور متوسط طبقے کے تاجروں کی صلاحیتوں سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکے گا، اس طرح ایسے تاجر روزگار کے مواقع بڑھانے اور معاشرے کی ضرورتیں پوری کرنے میں اہم کردار ادا کر سکیں گے۔

غیر سودی سرمایہ کاری میں قرضوں کی عدم ادائی سے ہونے والے نقصان کے بارے میں زیادہ تشویش نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ پوری دنیا میں اس سلسلے میں جو تجربہ ہوا ہے وہ کافی تسلی بخش ہے۔ غریب اور متوسط طبقے کے لوگ پاکستان کے اُن رئیس قرضے لینے والوں کی طرح بے اصول اور ابن الوقت نہیں ہوتے جو قرض لے کر اسے ادا کرنے کی کوئی نیت نہیں رکھتے اور رشوت دے کر یا سیاسی اثر و رسوخ کے ذریعہ قرضے معاف کروا لیتے ہیں۔ بین الاقوامی فنڈ برائے زرعی ترقی International Fund for Agricultural Development, (IFAD) کے تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ غریب طبقے کے باصلاحیت لوگوں کو جو قرض دیے گئے وہ انھوں نے اپنی آمدنی بڑھنے کی وجہ سے جلد ہی ادا کر دیے۔[۱۵] کئی ممالک میں چھوٹے قرضوں کے پروگرام (Micro Credit Programmes) کے ایسے ہی مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں کہ چھوٹے قرضوں کی واپسی کے لیے کارگر اور مجرّب طریقے اختیار نہ کیے جائیں۔ اس کے لیے بہت سے طریقے دنیا میں اختیار کیے گئے ہیں جن میں سے ایک قرضوں کا انشورنس بھی ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان میں بینکاری کا نظام دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے کا بہت بڑا سبب بن گیا ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ۱۹۹۴ء میں جہاں ایک لاکھ روپے سے کم ڈپازٹ والے کھاتوں نے بینکوں کے مجموعی کھاتوں کا ۴۰۹ء۲ فی صد فراہم کیا تھا وہاں ایک لاکھ سے کم قرضہ لینے والوں کو تمام قرضوں کا صرف ۴۰۳ء فی صد میسر ہوا۔[۱۶] اور جہاں ایک کروڑ سے زیادہ رقم کے کھاتہ داروں نے بینکوں کے کل کھاتوں کا صرف ۴۰۷ء۱ فی صد فراہم کیا وہاں انہیں بینکوں کے مجموعی قرضوں کا ۵۵۰۶ء فی صد ملا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ تمام بینکوں کو ۲۸۰۴ء ملین کھاتہ داروں نے جو رقم فراہم کی اس کا ۵۵۰۶ء فی صد صرف ۷۰۳ء، ۴ قرض لینے والوں کو مل گیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا بینکاری کا نظام ترکیز دولت کا باعث تو بن سکتا ہے لیکن اسلام کے عادلانہ تقسیم دولت کا خواب ہرگز پورا نہیں کر سکتا۔[۱۷] ۱۹۹۲ میں جو قانونی تبدیلیاں کی گئیں اُن سے بھی کچھ زیادہ بہتری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

(۴) اقتصادی استحکام

بہت سی معروف وجوہات کی بنا پر انسانی تاریخ اقتصادی سرگرمیوں میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں ان میں سے ایک وجہ قدرتی حادثات (Natural Phenomena) ہیں، جیسے خشک سالی، سیلاب اور زلزلے، جن پر قابو پانا انسان کے لیے اب تک مشکل رہا ہے۔ ایک اور بہت اہم سبب پچھلی تین دہائیوں میں دنیا کی مالیاتی منڈیوں (Financial Markets) میں غیر معمولی بحران ہے، جس کے نتیجے میں اقتصادی غیر یقینی میں شدید اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بھی کئی اسباب ہیں۔ لیکن نوبل انعام یافتہ ماہر معاشیات ملٹن فریڈمین (Milton Friedman) کے مطابق اس کی ایک بہت بڑی وجہ سود کی شرحوں میں غیر معمولی اتار چڑھاؤ (Volatility) ہے[۱۸]۔ اس اتار چڑھاؤ کی وجہ سے سرمایہ کاری کی منڈیوں میں زبردست غیر یقینی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ جس کے باعث تاجروں کے لیے اعتماد کے ساتھ طویل مدت کی سرمایہ کاری کا فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا ہے اور قرض دینے اور لینے والے دونوں اپنے آپ کو زیادہ نقصان سے بچانے کے لیے مختصر مدّت کے قرضوں پر حد سے زیادہ انحصار کرنے لگے ہیں۔ چناں چہ ذاتی سرمایہ کی بنیاد پر سرمایہ کاری (Equity) کے مقابلے میں مختصر میعاد کے قرضوں کی بنیاد پر سرمایہ کاری کا تناسب، یعنی لیوریج (Leverage)، خاصا بڑھ گیا ہے[۱۹]۔ لیکن اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ لیوریج جتنا زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اثاثوں کی قیمتوں میں کسی وجہ سے کمی ہوجانے کے باعث قرض کا ادا کرنا مشکل ہوجاتا ہے اور مالی بحران شدت اختیار کر جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ مختصر میعاد کے قرضوں میں زیادتی سے مالیاتی منڈیوں میں عدم استحکام کیوں بڑھ جاتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرض دینے والوں کے لیے مختصر میعاد کے قرضے واپس لینا آسان ہوتا ہے۔ لیکن قرضے لینے والوں کے لیے واپس کرنا اس صورت میں مشکل ہوتا ہے جب کہ انھوں نے وہ رقم درمیانی یا طویل مدت کے منصوبوں میں لگائی ہو۔ ایسے منصوبوں کے تکمل ہونے میں دیر لگتی ہے اور رقم کافی عرصہ کے لیے بندھ جاتی ہے، جس کی وجہ سے ادائی مشکل ہوجاتی ہے۔ اس لیے جب مختصر مدت کے قرضوں کی افراط ہوتی ہے تو رقم غیر ملکی کرنسی، اجناس، پراپرٹی اور حصص کے بازاروں میں سٹے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے قرض لینے والے کی رقم کم مدت کے لیے بندھتی ہے لیکن مالیاتی عدم استحکام کے بڑھنے کا امکان زیادہ ہوجاتا ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ مختصر مدت کے قرضے نہیں لینے چاہئیں۔ معقول رقم کے ایسے قرضے لینے میں کوئی حرج نہیں، جن کا مقصد اس رقم سے حقیقی اشیاء اور خدمات (Real Goods and Services) کی خرید وفروخت ہو۔ اس مقصد کے لیے اسلام کے مالی نظام میں غیر سودی طریقے موجود ہیں۔ لیکن اگر ایسے مختصر میعاد کے قرضوں کا تناسب بہت بڑھ جائے، جیسا کہ آج کل دنیا کے مختلف مما لک میں ہوا ہے، تو کافی رقم سٹے (Speculation) کے لیے استعمال ہوتی ہے، جس سے مالیاتی منڈیوں میں عدم استحکام بڑھ جاتا ہے۔ اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ہم نیچے تین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مثال مشرقی ایشیا کا مالی بحران ہے۔ دوسری مثال امریکہ کی Long Term Capital Management (LTCM) طویل المیعاد سرمائے کا کاروبار کرنے والی کمپنی کا ڈھیر ہونا ہے اور تیسری مثال غیر ملکی نقد کے بازار میں بار بار بحران کا آنا ہے۔

مشرقی ایشیا کا مالی بحران

مشرقی ایشیا کے بعض مما لک نے بہت تیز رفتار معاشی ترقی کی، جس کی وجہ سے انھیں مشرقی چیتے (Eastern Tigers) کہا جاتا ہے۔ لیکن ۱۹۹۷ء میں یہ مما لک ایک بہت زبردست بحران کا شکار ہو گئے۔ یہ مما لک اس بحران کا شکار کیوں ہوئے؟ کیا اُن کی حکومتوں کی مالیاتی پالیسیاں پاکستان کی طرح غیر صحت مندانہ تھیں؟ یہ وجہ ہرگز نہیں تھی۔ یہی نہیں کہ ان کے بجٹوں میں عام طور پر کوئی خسارہ (Deficit) نہیں تھا۔ بلکہ ان میں بچت (Surplus) تھی۔ اس کے علاوہ ان ملکوں کی مجموعی بچت بھی ان کی قومی پیداوار کا تقریباً ۳۵ فی صد تھی۔ یہ خوبیاں بہت سے ترقی پسند مما لک کے لیے رشک کا باعث ہیں۔

لیکن پھر سوال یہ ہے کہ ان سب خوبیوں کے باوجود بحران کیوں آیا؟ اس کی ایک بہت بڑی وجہ جو متفقہ طور پر بیشتر محققین نے بتائی ہے وہ یہ ہے کہ مختصر میعاد کے غیر ملکی قرضوں کا ان ملکوں میں بہاؤ (Inflow) باہر سے آنے والے پورے سرمائے کا ۶۰ فی صد سے بھی زیادہ تھا۔ اس کی وجہ سے داخلی بینکوں نے نجی شعبے کو خوب دل کھول کر مختصر میعاد کے قرضے دیے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ایسے قرضوں کی افراط سٹے میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ان مختصر میعاد کے قرضوں کی وجہ سے اسٹاک اور پراپرٹی مارکیٹوں میں سٹے کے کاروبار میں گرمی کا سبب بنی اور قیمتیں بہت اوپر گئیں۔ بینکوں نے ضمانت (Collateral) پر اعتماد کرنے کی عام غلطی کی تھی اور ان

قرضوں کے پیچھے جو خطرات (Risks) مضمر تھے، ان کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ جیسے ہی حالات نے پلٹا کھایا، جو کسی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے، تو غیر ملکی بینکوں نے اپنے مختصر مدت کے قرضے واپس مانگنا شروع کر دیئے۔ ملکی بینکوں نے بھی جب اپنے قرضے واپس لینا چاہے تو قرض داروں نے اپنے اثاثے تیزی سے بیچنا شروع کر دیئے۔ اسٹاک اور پراپرٹی مارکیٹ میں دام بہت تیزی سے گرے اور قرض داروں کے لیے قرض ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ بینکاری کے نظام میں اس وجہ سے ایک زبردست بحران پیدا ہوا۔ اور بین الاقوامی ادارۂ زر (IMF) کو غیر ملکی بینکوں کو بحران سے بچانے کے لیے (Bailout) ایک بہت بڑے قرضے کا اہتمام کرنا پڑا۔ اس طرح غیر ملکی بینک تو بچ کر نکل گئے۔ مگر ملکی بینکوں کے جو قرضے واجب الادا تھے وہ (IMF) کے قرضوں کی وجہ سے حکومتوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ ان حکومتوں کے یہ قرضے اب کون ادا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ بوجھ بالآخر ٹیکس دینے والوں کے کندھوں پر ہی پڑے گا۔

اگر اسلام کا غیر سودی نظام ہوتا اور بینک نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتے۔ تو پھر وہ خطرات کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کرتے اور ضمانت پر پوری طرح اعتماد نہ کرتے۔ اس طرح وہ اس قدر فراوانی سے قرضے نہ دیتے اور اسٹاک اور پراپرٹی مارکیٹوں میں نہ اس قدر گرمی آتی اور نہ بعد میں اس قدر قیمتیں گرتیں۔ نفع اور نقصان میں شراکت سے بینکاری کے نظام میں ایک ایسی ڈسپلن (Discipline) پیدا ہوتی ہے جس سے بحرانوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ بات اب بین الاقوامی علمی حلقوں میں عام طور پر قبول کی جانے لگی ہے۔

LTCM کا ڈھیر ہونا

(Long Term Capital Managemnet)LTCM امریکہ کا ایک ہیج فنڈ (Hedge Fund) ہے۔ جس کا بنیادی مقصد اسٹاک، پراپرٹی، اجناس اور غیر ملکی زرمبادلہ کے بازاروں میں سٹے کا کاروبار کرنا ہے۔ اس قسم کے ہیج فنڈز کا اپنا ذاتی سرمایہ (Equity) کم اور قرضوں پر اعتماد زیادہ ہوتا ہے۔ اس طرح ان کا لیوریج (Leverage) نسبتاً بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے فنڈز نے اپنے سٹے کی وجہ سے بین الاقوامی اسٹاک، پراپرٹی اور غیر ملکی زرمبادلہ کے بازاروں میں عدم استحکام پیدا کر دیا ہے۔ دنیا بھر کے اسٹاک اور غیر ملکی زرمبادلہ کے بازاروں میں جو بحران آئے ہیں ان میں اس قسم کے ہیج فنڈز کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ LTCM کا اپنا ذاتی سرمایہ بحران سے پہلے ۴ بلین ڈالر سے تھوڑا ہی زیادہ تھا۔ لیکن اس کا لیوریج ۲۵ تھا۔ یعنی اس نے اپنے ذاتی سرمایہ کے ایک ڈالر کے مقابلے میں ۲۵ ڈالر کا قرض لیا ہوا تھا۔ جب مختلف وجوہات کی بنا پر اس کے

اثاثوں کی قیمتیں کم ہونے لگیں تو اس نے مزید قرض لے لیا، جس سے لیوریج ۵۰ ہوگیا۔ اس کے اثاثوں کی قیمتوں میں کمی اور مزید قرض لینے کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ اس کا لیوریج ۱۶۷ تک پہنچ گیا۔[۲۰] اگر امریکہ کا فیڈرل ریزرو بینک (Federal Reserve Bank) اس کی مدد کے لیے نہ آتا تو یہ بحران پوری دنیا کے بینکاری کے نظام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا، جس سے پوری دنیا میں کساد بازاری کا امکان بڑھ جاتا، اور غریب ممالک کی مشکلات بہت بڑھ جاتیں۔ بینک اگر نفع اور نقصان میں شریک ہوں تو وہ ہرگز اس قدر قرض کسی ایک کمپنی کو نہ دیں۔ یہ ضمانت (Collateral) پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہی تو ہے جو ان کو ایسا کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

غیر ملکی زرمبادلہ (Foreign Exchange) کے بازار میں بحران

کم مدت کے قرضوں پر بھاری انحصار نے بین الاقوامی زرمبادلہ کی منڈیوں کو بھی بڑی حد تک غیر مستحکم کر دیا ہے۔ زرمبادلہ کی منڈیوں میں روزانہ خرید و فروخت کی مالیت (Turnover) اپریل ۱۹۹۸ء میں ۱،۴۹۰ بلین ڈالر تھی۔[۲۱] اس کے مقابلے میں سامان تجارت کی روزانہ درآمد و برآمد صرف ۳۰ بلین ڈالر کے برابر تھی۔[۲۲] اس طرح دنیا بھر میں غیر ملکی زرمبادلہ کی روزانہ خرید و فروخت سامان تجارت کی مالیت کا ۴۹ گنا تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر ملکی زرمبادلہ کی خرید و فروخت کا بیشتر حصہ سٹے کی غرض کے لیے ہوتا ہے اور زرمبادلہ کی شرحوں میں حد سے زیادہ اتار چڑھاؤ کا یہ ایک بہت بڑا سبب ہے۔ اس لیے B.I.S. (بینک فار انٹرنیشنل سیٹل منٹس (Bank for International Settlements) کے جنرل منیجر اینڈرو کروکٹ (Andrew Crocket) نے ٹھیک کہا ہے کہ "ہماری معیشت ادائیگیوں کے نظام کی کمر ٹوٹنے کے خطرے کی وجہ سے غیر محفوظ ہوتی جارہی ہے۔"[۲۳]

اگر کم مدت کے قرضوں پر زیادہ انحصار مناسب نہیں۔ تو پھر طویل مدت کے قرضوں اور نفع اور نقصان میں شراکت پر مبنی سرمایہ کاری (Equity) پر انحصار کو بڑھانا ہوگا۔ ان دونوں میں سے ذاتی سرمایہ پر مبنی سرمایہ کاری (Equity) بہتر ہے کیوں کہ اس میں سرمایہ لگانے والا منصوبوں کی اچھی طرح چھان بین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔[۲۴] اس سے سرمایہ کاری کے کام میں زیادہ ڈسپلن آتی ہے اور معیشت میں بہتری پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے دنیا کے کئی مشہور اسکالرز نے جن میں G.L.Bach, Joan Robinson, Kindleberger Charles, Hyman Minsky, Henry Simons اور Kenneth Rogoff شامل ہیں۔ یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک ایسی معیشت

جس میں ذاتی سرمایہ پر مبنی سرمایہ کاری پر زیادہ انحصار کیا گیا ہو، قرضوں پر زیادہ اعتماد کرنے والی معیشت کی نسبت زیادہ مستحکم ہوگی۔(۲۵)

حرف آخر

پس یہ ظاہر ہوا کہ ذاتی حصص کی سرمایہ کاری پر مبنی نظام فلاحِ انسانی کے حصول کے لیے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ ایسے نظام میں یہ ممکن ہوگا کہ تمام انسانوں کی ضروریات زندگی زیادہ بہتر طریقہ پر پوری ہوں۔ تمام لوگوں کو قابل احترام ذریعہ سے معاش مل سکے۔ آمدنی اور دولت کی عادلانہ تقسیم ہو اور مالی اور اقتصادی استحکام میسر ہو۔ سرمایہ دارانہ نظام ان تمام مقاصد کو موثر طریقہ پر حاصل نہیں کرسکتا۔ اس ناکامی کی وجہ یہ نہیں کہ اس نظام پر عمل کرنے والے ممالک کا نصب العین انسانی فلاح کا حصول نہیں یا یہ کہ ان کے پاس ایسے عزم اور وسائل کی کمی ہے جو ان مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔

ان کی ناکامی کی بنیادی وجہ وہ کلیدی تضاد ہے جو اس نظام کے نصب العین اور اس کی حکمت عملی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ان ممالک کا اعلان شدہ نصب العین تو انسانی بہبود ہے جس کا سرچشمہ ان ممالک کی دینی اقدار ہیں، لیکن اس کے برخلاف ان کی حکمت عملی کی بنیاد ان کی دینی اقدار نہیں بلکہ سوشل ڈارونزم کا لادینی فلسفہ ہے۔ جو طاقت ور افراد کے بقا اور کم زوروں کے خاتمے کو روا رکھتا ہے۔ یہ حکمت عملی سرمایہ کے مختلف استعمالوں کے درمیان تقسیم (Allocation of Resources) کے لیے شرح سود کو کلیدی درجہ دیتی ہے۔ اس سے مال دار لوگوں کو وسائل کے حصول میں فوقیت حاصل ہوتی ہے، جس کی وجہ سے یہی نہیں کہ امیر زیادہ امیر بنتے ہیں اور اس طرح دولت کا ارتکاز ہوتا ہے بلکہ یہ کہ دکھاوے، عیاشی، سٹے اور غیر ضروری اخراجات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے انسانی فلاح کے حصول کو زک پہنچتی ہے اور سرمایہ کی بین الاقوامی منڈیوں میں عدم استحکام بھی پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ ملز (Mills) اور پریسلے (Presley) نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> ''اگر ہم پلٹ کر تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس بات پر یقین کرنے کے لیے کافی دلائل ملتے ہیں کہ کاش سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں سود کی حرمت کی مخالفت نہ کی گئی ہوتی۔ سود کی حرمت کے اخلاقی موقف کے پیچھے جو عملی حکمت ہے اس کا اس وقت صحیح ادراک نہیں تھا۔''(۲۶)

حواشی باب دوم

(۱) یہودیت اور نصرانیت میں سود کی حرمت کے بارے میں دیکھیں۔ Hastings کی Encyclopaedia of Religion and Ethics میں John, et. al, کا "Usury" پر مضمون۔ ج ۱۲، ص ۵۴۸-۵۵۸۔ اس کے علاوہ دیکھیے ۱۹۰۷ Noonan، ص ۲۰۔ ہندومت میں سود کی مذمت کے بارے میں دیکھیے، Bokare، ۱۹۹۳ء ص ۱۶۸۔

(۲) دیکھیے John, et. al ص ۵۵۸۔

(۳) دیکھیے بائبل کی کتاب Ezekiel، ۱۸: ۸، ۱۳، ۷ اور ۲۲:۲۵-۲۷۔ Leviticus، ۲۵:۳۶-۳۸۔ Deuteronomy، ۲۳:۱۹اور Luke، ۶:۳۵

(۴) دیکھیے Johns, et. al، ص ۵۵۱۔ لیٹرن (Lateran) وہ جگہ ہے جہاں پوپ (Pope) چودھویں صدی عیسوی تک رہتے تھے۔

(۵) دیکھیے Johns, et. al، اور Noonan، ۱۹۵۷۔

(۶) وَ نُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ نَجۡعَلَہُمۡ اَئِمَّۃً وَّ نَجۡعَلَہُمُ الۡوٰرِثِیۡنَ o (القصص:۵) ''ہم چاہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر مہربانی کریں جنھیں زمین میں کم زور بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور یہ بھی کہ انھیں قیادت کے مناصب عطا فرمائیں اور ان مناصب کے وارث بنائیں۔''

(۷) اس موضوع پر زیادہ طویل بحث کے لیے دیکھیے۔ مضمون نگار کی کتاب Towards a Just Moentary System, Pagew 19-29 and 107-145 اور مصنف کی ۱۹۹۲ء میں چھپی ہوئی کتاب کے صفحات ۳۲۴-۳۲۷۔ اس کے علاوہ دیکھیے مصنف کے دو مضامین جو ۲۰۰۰ء میں چھپے اور جو اس مضمون کے آخر میں فہرست کتب میں مذکور ہیں۔

(۸) یہ عدد صدر مشرف کی اس تقریر سے حاصل کیا گیا ہے جو انھوں نے مسلم سربراہ کانفرنس میں کی تھی جو کوالالمپور میں ۱۵ر اکتوبر ۲۰۰۳ء میں منعقد ہوئی تھی۔

(۹) ان اعداد و شمار کا ماخذ IMF کی Yearbook, ۲۰۰۰ ہے جس میں صفحہ ۱۷۷-۱۷۹ پر ایک جدول

ہے جس کا عنوان ہے۔ Consumption as percent of GDP بچت کے اعداد و شمار اسی سے اخذ کیے گئے ہیں۔

(۱۰) Oecd, Economic Outlook, December 1991, Table 2, p-7; and June 2000, Table 22, P-266

(۱۱) Peach and Steindel, September 2000, P 1

(۱۲) Bigsten, 1987, P 156

(۱۳) Mishan, 1971, P 205

(۱۴) Morgan Guarantee Trust Company of New York, 1987, P 7

(۱۵) The Economist, 16 February 1985, P 15

(۱۶) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب Towards a Just Monetary System, 1985, Pp 200-02

(۱۷) تفصیل اور مراجع کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب The Future of Economics: an Islamic Perspective, 2000c, Pp 283-85

(۱۸) Friedman, 1982, P 4

(۱۹) اگر کسی کا ذاتی سرمایہ ایک روپیہ ہے اور وہ دس روپے سرمایہ کاری کے لیے ادھار لیتا ہے تو اس کا لیوریج (Leverage) دس ہوگا اور اگر 25 روپے قرض لیتا ہے تو لیوریج 25 ہوگا۔

(۲۰) Imf, World Economic Outlook, December 1998, P 55

(۲۱) دیکھیے BIS کی ۱۹/اکتوبر ۱۹۹۸ء کی پریس ریلیز۔

(۲۲) دنیا بھر کے مجموعی درآمدات اور برآمدات اپریل ۱۹۹۸ء میں 9,087 بلین ڈالر تھے Imf, International Financial Statistics, November 1998 اس طرح اپریل 1998 میں روزانہ کی متوسط تجارت 30.30 بلین ڈالر تھی۔

(۲۳) Bis Press Release, 22 June 1994, P 3

(۲۴) Imf, World Economic Outlook, May 1998, P 82

(۲۵) Minsky, 1975

Simons, 1948, P 320

Joan Robinson, December, 1977, P 133

Kindleberger, 1978, P 66

Bach, 1977, P 182: And Rogoff, Fall 1999, P 211-216.

(۲۶) Mills and Presley, 1999, P 120

باب سوم

کیا غیر سُودی نظام بینکاری ممکن ہے؟

پچھلے دو مقالوں میں جن دو سوالوں پر بحث کی گئی تھی وہ یہ تھے کہ کیا اسلام میں سود واقعی حرام ہے؟ اور اگر واقعی حرام ہے تو اس کے پیچھے کیا حکمت کارفرما ہے؟ ان دو سوالوں کا جواب دینے کے بعد جو تیسرا سوال قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا دور جدید میں سود کے لین دین کے بغیر ایک قابل عمل اور موثر مالیاتی و بینکاری نظام قائم کیا جا سکتا ہے؟

مسلمانوں کی اکثریت اور بعض مغربی مفکّر بھی اس سوال کا مثبت جواب دیتے ہیں جب کہ بعض دوسرے لوگ، جن میں کچھ مسلمان بھی شامل ہیں، اس کا منفی جواب دیتے ہیں۔ اس منفی جواب کے پیچھے ان کی دلیل یہ ہے کہ شرح سود ایک قیمت ہے اور دوسری تمام اشیاء کی قیمتوں کی طرح کسی معیشت میں مالی وسائل کی طلب اور رسد کے درمیان توازن قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر سود کو ختم کر دیا جائے تو مالی وسائل کس طرح اکٹھے کیے جائیں گے اور کس طرح استعمال ہوں گے۔ قیمت کے بغیر طلب بہت زیادہ ہوگی اور مالی وسائل فراہم کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ اس طرح طلب اور رسد کے درمیان توازن ختم ہو جائے گا۔ اس لیے ان کا اصرار ہے کہ باوجود اس کے کہ سود بہت سی خرابیوں کا سرچشمہ ہے ہمیں اسے برداشت کرنا ہوگا۔

اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا کہ بچت کرنے والوں کی فاضل رقوم اکٹھا کرنے اور انھیں استعمال کرنے والوں کے درمیان تقسیم کرنے کے لیے ایک ایسی قیمت کا ہونا ضروری ہے جو نہ صرف یہ کہ طلب اور رسد میں توازن قائم کرے بلکہ اسے برقرار بھی رکھے۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ کون سی قیمت سب سے زیادہ مناسب ہے۔ قاری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ وہی قیمت سب سے زیادہ مناسب ہے جو طلب اور رسد میں توازن قائم کرنے کے علاوہ ہمیں اپنے اصل مقصد کے حصول میں بھی مدد کرے۔

یہ مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ مقصد تمام انسانوں کی بلا کسی امتیاز فلاح ہے چاہے وہ گورے ہوں یا کالے، امیر ہوں یا غریب، مرد ہوں یا عورت اور بچے ہوں یا بوڑھے۔ ایسی فلاح اسی صورت میں حاصل ہوسکتی جب چند ذیلی مقاصد پورے ہوں۔ ان میں سے چار جو بہت ضروری ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام انسانوں کی کم از کم بنیادی ضروریات زندگی پوری ہوں، روزگار کے مواقع بڑھیں تاکہ ہر شخص اپنی صلاحیتوں اور محنت کی مناسبت سے روزی کما سکے، دولت کی عادلانہ تقسیم ہو، اور معاشی استحکام بھی میسر ہو۔

پچھلے مقالے میں یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ انسانی فلاح و بہبود کے حصول کے لیے مندرجہ بالا ذیلی مقاصد کی تکمیل ایک سودی نظام میں بدرجہ اتم پوری نہیں ہوسکتی۔ سودی نظام میں قرضوں کی حوصلہ افزائی اور آسان فراہمی ہوتی ہے جس کے باعث افراد اور حکومتوں میں اپنی آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرنے کا رجحان بڑھتا ہے۔ اس سے ایک طرف تو بچت میں کمی ہوتی ہے اور دوسری طرف اقتصادی کلی (Macroeconomic) کی مشکلات کے علاوہ مالیاتی نظام میں بھی عدم استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ وسائل جو زندگی کی اہم ضرورتیں پوری کرنے اور پیداواری سرمایہ کاری کو بڑھانے کے لیے درکار ہوتے ہیں، وہ تعیش اور غیر مفید استعمال کے بڑھنے کی وجہ سے کم ہوجاتے ہیں۔ بچت میں یہ کمی، معیشت کی ساخت میں لچک کے فقدان (Structural Rigidities) اور دوسری سماجی اور اقتصادی کمزوریوں کے ساتھ مل کر سرمایہ کاری کی شرح اور روزگار کے مواقع میں بڑھوتری کو کم کردیتی ہے اور معاشی ترقی پر من حیث المجموع بُرا اثر ڈالتی ہے۔ غریب لوگوں پر اس وجہ سے سب سے زیادہ برا اثر پڑتا ہے اور معاشی عدم مساوات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر دوسرے مذاہب کی طرح اسلام نے بھی سود کو حرام قرار دیا ہے۔ حکومت اور نجی شعبے کے غیر ضروری اخراجات میں کمی کے باعث توقع کی جاسکتی ہے کہ قومی بچت میں اضافہ ہوگا اور ذاتی سرمایہ کی بنیاد پر سرمایہ کاری کو فروغ حاصل ہوگا۔ تاہم چوں کہ اسلام ایک حقیقت پسند اور قابل عمل دین ہے وہ ادھار کو بھی روا رکھتا ہے۔ بشرطے کہ وہ حقیقی اشیاء اور خدمات کی خرید و فروخت کے لیے ہو اور اجناس، حصص، پراپرٹی اور زرمبادلہ کے بازاروں میں سٹے کے لیے نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے اس نے بعض غیر سودی طریقے بھی فراہم کیے ہیں۔ جو ہم اس مقالے میں آگے چل کر دیکھیں گے۔ اس طرح ایک اسلامی معیشت میں

مالی لین دین دو طریقوں سے ہوگا۔ ان میں سے ایک نفع اور نقصان میں شراکت کی بنیاد پر ہوگا اور دوسرا اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ پر حقیقی اشیاء کی ادھار خرید وفروخت کے ذریعے۔

نفع اور نقصان میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری

اسلام میں سرمایہ کاری کے سب سے زیادہ پسندیدہ طریقے مضاربت[1] اور مشارکت[2] ہیں۔ سرمایہ کاری کے ان دونوں طریقوں میں صاحبِ مال قرض دینے والے کی طرح سود نہیں لیتا۔ بلکہ نفع اور نقصان میں شریک ہوتا ہے۔ اگر نفع ہوا تو ایک طے شدہ تناسب سے اس کو اس نفع میں حصہ ملے گا۔ اور اگر نقصان ہوا تو وہ اسے اپنے سرمایہ کے تناسب سے برداشت کرے گا۔ نفع میں شرکت کی نسبت کوئی بھی ہوسکتی ہے جس پر صاحب مال اور مضارب میں اسلام کے عادلانہ اصولوں کی بنیاد پر اتفاق ہو جائے۔ اس نسبت کے طے کرنے میں کئی عناصر کو مدنظر رکھا جائے گا۔ جس میں صلاحیت، شہرت، محنت اور خطرات شامل ہیں۔ لیکن نقصان میں شرکت کی نسبت صرف سرمایہ کے تناسب سے ہی ہوسکتی ہے[3] نقصان میں شراکت صاحب مال کے فراہم کردہ سرمایہ کی حد تک ہی ہوگی اس سے زیادہ نہیں۔ کمپنیوں کے حصص میں سرمایہ کاری چوں کہ نفع اور نقصان میں شراکت کی بنیاد پر ہوتی ہے اس لیے وہ بھی قابل قبول ہیں۔ ایسی کمپنیوں کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری ہوسکتی ہے اور زیادہ خطرات بھی جھیلے جاسکتے ہیں۔ اس کے لیے مناسب قوانین کے تحت ایک منظّم بازار حصص (اسٹاک مارکیٹ) کی موجودگی ضروری ہے تاکہ سرمایہ کار جب چاہے اپنے حصص کو فروخت کر سکے۔ یہ ایسی سہولت ہے جو مضاربت اور مشارکت کی سرمایہ کاری میں موجود نہیں۔ کمپنیوں کے حصص حکومتوں اور کمپنیوں کے لیے سود پر مبنی بانڈ کا نعم البدل ہوسکتے ہیں۔

تاریخی شہادت

نفع اور نقصان میں شراکت پر مبنی نظام کا جو مختصر خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے وہ تو اس وقت دنیا میں کہیں بھی پوری طرح رائج نہیں ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخ میں کبھی ایسا نظام رائج ہوا ہے۔ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنی پیداواری اور تجارتی سرگرمیوں کی سرمایہ کاری کے لیے مضاربت اور مشارکت پر مبنی ایک غیر سودی مالیاتی نظام

کام یابی کے ساتھ صدیوں تک چلایا تھا۔ پروفیسر یوڈووچ (Udovitch)، جو پرنسٹن یونی ورسٹی میں مشرق قریب کے ڈپارٹمنٹ کے صدر تھے، لکھتے ہیں کہ ”مضاربت اور مشارکت کے طریقوں نے قرون وسطیٰ میں اس بات کو ممکن بنا دیا تھا کہ معاشرے کے پاس جو مالیاتی وسائل میسر ہیں وہ پورے کے پورے جمع کر کے زراعت، صنعت وحرفت اور طویل فاصلوں کی تجارت کے فروغ کے لیے استعمال کیے جائیں[۴] اور یہ طریقے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ یہودی اور عیسائی بھی اس حد تک استعمال کرتے تھے کہ سود پر مبنی قرضوں کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔“[۵]
پروفیسر گوئیٹائن (Goitein) کے مطابق سود کے خلاف یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے قانون کی خلاف ورزی ان کو مصر کے جنیزہ دستاویزات (Geniza Documets) کے صرف ایک ہی متن میں ملی جب کہ ان دستاویزات کا ایک بہت بڑا حصہ سرمایہ کاری سے تعلق رکھتا تھا۔[۶]
پروفیسر شاٹزملر (Schatzmiller) بھی اسی نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ ہسپانیہ میں اسلامی تاریخ کے شروع ہی کے دور سے دولت مند افراد نے سرمایہ کاری کو فروغ دیا تھا اور سود کی حرمت نے ان کے لیے اس کام میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پیدا کی تھی۔[۷]

اسلامی تاریخ میں جو لوگ بینکوں کی قسم کی خدمات انجام دیتے تھے انھیں صَرّاف کہا جاتا تھا۔ عباسی خلیفہ المقتدر، جن کی خلافت (۲۹۵ ہجری/ ۹۰۸ عیسوی سے ۳۲۰ ہجری/ ۹۳۳ عیسوی) تک رہی، ان کے دور کے شروع ہی سے صراف جدید بینکوں کے بیشتر فرائض انجام دینے لگے تھے۔[۸] ان کی اپنی منڈیاں تھیں جن میں زراعت، صنعت وتجارت کے لیے بینکنگ کی بیشتر ضروریات نیویارک میں وال اسٹریٹ اور لندن میں لومبارڈ اسٹریٹ کی طرح اس زمانے کی فنی ترقی کے دائرے میں پوری کی جاتی تھیں[۹]۔ لیکن چوں کہ یہ صراف جدید دور کی فنی اصطلاح کے مطابق بینک نہیں کہلاتے تھے اس لیے یوڈووچ نے ان کو ”بغیرِ بینک کے بینکار“ کہنے کو ترجیح دی ہے۔[۱۰]

اسلامی تاریخ میں صرافوں کے ذریعہ سرمایہ کاری کے لیے بچتوں کے بڑے پیمانے پر استعمال کیے جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی زراعت وصنعت وتجارت کو زبردست فروغ ملا تھا۔ اور ان کی تجارت مغرب میں مراکش اور ہسپانیہ تک، مشرق میں ہندستان، منڈانا ؤ اور چین تک، شمال میں وسطیٰ ایشیا تک، اور جنوب میں افریقہ تک پھیل گئی تھی۔ اس کا ثبوت صرف تاریخی

دستاویزات سے ہی نہیں بلکہ ساتویں صدی سے گیارہویں صدی تک جاری شدہ مسلمانوں کے ان سکوں سے بھی ملتا ہے، جو آثار قدیمہ کی کھدائی کے ذریعہ روس، فن لینڈ، سویڈن، ناروے، جزیرہ ہائے برطانیہ اور آئس لینڈ میں پائے گئے ہیں۔ خیال فرمائیے کہ یہ ممالک عالم اسلام کا حصہ نہیں تھے بلکہ اس کے گردونواح میں واقع تھے۔[11] اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دور دراز ممالک کے ساتھ بھی تجارت ہوتی تھی اور اس کے لیے جس سرمایہ کاری کی ضرورت تھی وہ میسر تھی۔

بہت سے تاریخی عوامل کی بنا پر عالم اسلام اپنی اخلاقی، فنی اور اقتصادی برتری سے محروم ہوگیا۔[12] اس وجہ سے استعماری طاقتوں نے بیشتر مسلمان ملکوں پر قبضہ کرلیا اور بہت سے اسلامی اداروں کی جگہ اپنے اداروں کو نافذ کردیا۔ ان اداروں میں اسلام کا سرمایہ کاری کا نظام بھی شامل تھا۔ لیکن اللہ کے فضل سے مسلمان ملکوں کی آزادی سے احیاے اسلام کی تحریکوں کو تقویت ملی ہے اور بہت سے گم شدہ اداروں کے احیاء کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مضاربت اور مشارکت کے طریقے ماضی کی طرح ایک بار پھر سرمایہ کاری کے فروغ اور صحت مندانہ انداز میں معاشی ترقی کے لیے وہی فعال اور محترم کردار ادا کرسکتے ہیں، جو انھوں نے ماضی میں کیا تھا۔

ایسا نہ کرنے کی بہ ظاہر تو کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس وقت سے اب تک دنیا میں جو فنی ترقی ہوئی ہے خاص طور سے ذرائع مواصلات میں ارتقاء، محاسبہ اور اس کی تنقیح (Accounting and auditing) کے طریقوں میں بہتری، اور ان سب سے بڑھ کر ذرائع معلومات (Information Technology) میں انقلاب، اس کی وجہ اسلام کے سرمایہ کاری کے طریقوں پر عمل کرنا نسبتاً آسان ہوگا۔ ان سہولتوں کی مدد سے حسابات کو بہتر بنانے، اخراجات اور آمدنی کے ریکارڈ کو زیادہ شفاف بنانے، منافع کا صحیح اندازہ کرنے اور ان سب کی نگرانی اور جانچ پڑتال کو موثر بنانے میں زیادہ مدد مل سکتی ہے۔

فروخت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کے طریقے

ان سب سہولتوں کے باوجود مضاربت اور مشارکت کے ذریعہ تمام مالیاتی ضرورتوں کو پورا کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً کسی کو رہنے کے لیے مکان چاہیے اور وہ اسے خرید نہیں سکتا یا خریدنا نہیں چاہتا تو وہ کسی مکان کا حق استعمال کرایہ دے کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس میں نفع و نقصان کی

شراکت ممکن نہیں۔ یا پھر کسی کو گاڑی خریدنی ہے اور وہ قیمت فوراً ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے قسطوں میں ادا کرنا چاہتا ہے۔ تو اس میں بھی نفع و نقصان کی شراکت ممکن نہیں۔ چوں کہ شریعت کی تعلیمات حقیقت پسندی پر مبنی ہیں اس لیے وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان تمام ذرائع کے استعمال کی اجازت دیتی ہے جو اس کی دی ہوئی اقدار سے ٹکراتے نہ ہوں۔ اس لیے اس نے حقیقی اشیاء یا ان کے حق استعمال کی خرید و فروخت کے لیے بعض طریقوں کو جائز قرار دیا ہے۔ ان میں سے زیادہ معروف اور مستعمل طریقے بیع مؤجل یا مرابحہ، اجارہ، سلم اور استصناع ہیں۔ یہ سب طریقے حقیقی اشیاء یا ان کے حق استعمال کی خرید و فروخت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مقصد لوگوں کو سود میں ملوث ہوئے بغیر ان چیزوں تک رسائی کے قابل بنانا ہے جو وہ چاہتے ہیں لیکن جن کی قیمت یا تو وہ فوری طور پر ادا نہیں کر سکتے یا نہیں کرنا چاہتے۔ ان سب میں جہاں خریدار کے لیے سہولت ہے کہ اسے ایک چیز یا اس کا بلا ملکیت حق استعمال پوری رقم فوراً ادا کیے بغیر میسر ہو جائے، وہاں صاحب مال کے لیے یہ اطمینان ہے کہ اسے نفع و نقصان میں شراکت کے مقابلے میں کم خطرات کو جھیلنا پڑے گا۔

ان سب طریقوں میں جو طریقے سب سے زیادہ مستعمل ہیں وہ بیع مؤجل اور اجارہ ہیں۔ بیع مؤجل میں ایک شخص ایک چیز ابھی خریدتا ہے لیکن اس کی قیمت باہمی مفاہمت سے بعد میں یک مشت یا قسطوں میں ادا کرتا ہے۔ اسی کو مرابحہ بھی کہتے ہیں۔ اجارہ (Leasing) میں ایک شخص اپنی ضرورت کی چیز کو خریدتا نہیں بلکہ اس کے استعمال کا حق کرایہ دے کر حاصل کرتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کسی چیز کا حق استعمال اس مفاہمت پر حاصل کرے کہ اتنے عرصہ کے بعد وہ اس چیز کا مالک بن جائے گا۔ سَلَم میں بیع مؤجل کے برعکس خریدار قیمت پہلے ادا کرتا ہے اور چیز پہلے سے طے شدہ ایک معین مدت کے بعد وصول کرتا ہے۔ جیسے کسان اپنی ضرورت کی رقم حاصل کرنے کے لیے اپنی کپاس کی پیداوار کا کچھ حصہ پہلے سے فروخت کر دے اور اس کی سپردگی فصل تیار ہونے کے بعد ایک معین مدت کے اندر کرے۔ اس طرح کسان کو سود پر قرض لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اِستصناع میں ایک شخص اپنی ضرورت کی چیز کی فرمائش اس کے بنانے والے یا ٹھیکے دار سے کرتا ہے اور اس کی قیمت یا تو اس چیز کی سپردگی کے وقت ادا کرتا ہے یا

بعد میں حسب مفاہمت۔ اس کے علاوہ اور بھی طریقے ہیں لیکن وہ سب انہی طریقوں کی شاخیں ہیں اوران کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

مضاربت اور مشارکت اور خرید وفروخت کے ان سب طریقوں کے ذریعہ مالی اور سرمایہ کاری کی تمام ضروریات پوری ہوسکتی ہیں، چاہے وہ حکومت سے تعلق رکھتی ہوں یا نجی شعبہ سے۔ اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ غیر سودی نظام موجودہ دور کی تمام مالی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

چوں کہ کسی چیز کی ملکیت یا اس کے حق استعمال کے وصول کرنے کے لیے جو طریقے شریعت نے جائز قرار دیئے ہیں ان میں نفع کی شرح پیشگی متعین کی جاتی ہے، اس سے بہ ظاہر یہ محسوس ہوسکتا ہے کہ یہ تو سود ہی کی طرح ہے۔ یہی اعتراض رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی بعض لوگوں نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (البقرہ: ۲۷۵) یعنی یہ کہ بیع (خرید و فروخت) بھی تو رِبا (سود) ہی کی طرح ہے۔'' اس لیے کہ اس میں نفع کی شرح پہلے سے متعین کی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیوں کہ شریعت نے ان طریقوں کے جواز کے لیے کچھ شرائط مقرر کی ہیں۔ ان شرائط کا مقصد اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ صاحب مال بھی کسی حد تک خطرہ مول لے اور ادھار یا کرایہ پر لینے والے کے مفاد کا بھی تحفظ کیا جائے۔ ان شرائط کے پورا کرنے سے اس بات کا امکان نہیں رہے گا کہ یہ طریقے سرمایہ کاری کی ایسی صورت اختیار کرلیں جس سے غیر محسوس طریقے پر سود کی حرمت پامال ہو۔

اعتراضات

دور جدید میں سرمایہ کاری کے اسلامی طریقوں کے احیاء پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

اخلاقی انحطاط

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس دور میں جب لوگوں کی اخلاقی حالت گر چکی ہے، تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ بینک سے نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ لینے والے اپنے نفع کی صحیح شرح ظاہر کریں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صرف اخلاقی بلندی کے مفروضے پر کبھی کوئی

نظام نہیں چل سکتا اور نہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ معاملات کرتے ہیں۔ ہر زمانے میں لوگوں نے اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ اپنے گھروں اور دکانوں پر تالے لگائے ہیں۔ معاہدوں پر دستخط کیے ہیں۔ معاشروں اور حکومتوں نے بائیکاٹ اور سزاؤں کا نظام نافذ کیا ہے تاکہ جو لوگ چوری کرتے ہیں یا دھوکہ اور فریب سے کام لیتے ہیں انھیں سزا دی جائے۔

ان طریقوں میں سے ایک طلب و رسد کی بازاری قوتیں (Market Forces) ہیں۔ جو بڑی حد تک اخلاقی کم زوری پر قابو پاتی ہیں۔ بینکوں سے قرض لینے والے صرف ایک یا دو کاروبار تو نہیں ہوں گے۔ بلکہ ہزاروں کاروبار ہوں گے۔ اگر کسی نے بے ایمانی کی کوشش کی تو اس کا پتہ اس وقت چل جائے گا جب اس کی شرح نفع یا نقصان کا موازنہ دوسرے کاروباروں اور خصوصاً ایمان دار کاروباروں کے حسابات سے کیا جائے گا۔ بے ایمانی کرنے والے کاروباروں کی ساکھ گر جائے گی اور، چوں کہ یہ بات مشتہر ہوگی اور اس کا سب بینکوں اور تاجروں کو پتہ چل جائے گا، اس لیے ان پر مستقبل میں کوئی بھی بھروسا نہیں کرے گا۔ اس طرح وہ خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماریں گے اور اپنے مستقبل کو تاریک بنائیں گے۔

لیکن صرف بازاری قوتوں پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ بینکوں کو تحفظ فراہم کرنے اور ان کے کام میں مدد دینے کے لیے معاون ادارے (Shared Institutions) قائم کیے جائیں۔[۱۳] ان میں سے ایک بینکوں، کمپنیوں اور تاجروں کی قرض کی ساکھ معین کرنے والے ادارے (Credit Rating Agencies) ہیں۔ جو بینکوں سے معاملہ کرنے والے تمام تاجروں کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کریں گے۔ حسابات دیکھیں گے اور بازار میں ان کی شہرت کا اندازہ لگائیں گے۔

بہت سے ملکوں میں ایسے ادارے ہیں اور پاکستان میں بھی ایسے ادارے قائم ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان اداروں کو تقویت ملے گی۔ یہاں تک کہ تمام بینکوں، کمپنیوں اور تاجروں کی ساکھ کا علم ہو سکے گا۔ چوں کہ ساکھ کے درجہ کے تعین (Credit Rating) کے بغیر بینکوں سے نفع اور نقصان میں شراکت کی بنیاد پر معاملہ کرنا مشکل ہوگا، اس لیے سب ہی ایسے اداروں کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہوں گے۔ جو تعاون نہیں کریں گے، ان کی ساکھ صفر ہوگی۔ اس سے شفافیت بڑھے گی اور لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرنے میں آسانی

ہوگی۔ اس کے علاوہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ حسابات رکھنے (Accounting) اور ان کی جانچ پڑتال کرنے (Auditing) والے اداروں کی اصلاح کی جائے تا کہ اگر کوئی تاجر بینک کو صحیح نفع نہیں بتاتا، تو اسے تمام بینکوں کے مل کر قائم کیے ہوئے ایک تفتیشی ادارے (Audit Organization) کے پاس بھیجا جائے اور اگر اس کی جانچ پڑتال سے یہ ثابت ہو جائے کہ اس تاجر نے بے ایمانی کی ہے تو اس کا نام اخبارات میں مشتہر کیا جائے اور ایوان ہائے تجارت (Chambers of Commerce) اور تاجر برادریاں (Trade Associations) اس کا بائیکاٹ کریں۔

چوں کہ قرون اولیٰ میں ایسے لوگوں کو بری نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ضرورت ہو تو پورا معاشرہ ان کا بائیکاٹ بھی کرتا تھا، اس لیے وہ مجبور ہوتے تھے کہ اپنے معاہدوں کو پورا کریں اور دوسروں کے حقوق کما حقہ ادا کریں۔ کوئی وجہ نہیں کہ موجودہ زمانے میں بھی ایوان ہائے تجارت اور تاجر برادریاں ایسا ہی کردار ادا نہ کرسکیں تا کہ مسلمان معاشرے میں لوگ اپنے معاہدے پورے کریں اور لوگوں کا اعتبار ایک دوسرے پر بڑھے۔ ایسا طرزِ عمل صرف اسلامی بینکنگ ہی کے لیے نہیں بلکہ مسلم معاشرے کے تمام شعبوں کی اصلاح کے لیے بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا طرزِ عمل اختیار رکھا جائے تو تاجر دھوکہ دینے اور بے ایمانی کرنے سے ڈریں گے اور کمپنیوں کے ڈائریکٹر بھی حصہ داروں کا نفع ہڑپ کرنے سے گھبرائیں گے۔ قرآن کی اصطلاح ''اَمر بِالْمَعْرُوف اور نَہِی عَنِ الْمُنکَر'' کا صحیح معنیٰ پر نفاذ اسی وقت ہوسکتا ہے جب غلط کار لوگوں کو ان کے کیے کی سزا ملے۔ اس مقصد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بینک اور شرعی عدالتیں (Banking Tribunals and Shari'ah Courts) قائم کی جائیں تا کہ مقدمے کئی سال تک گھسٹتے نہ رہیں بلکہ ان کے فیصلے جلد ہو جائیں۔

ان سب اداروں کے ذکر کرنے کے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کی ضرورت صرف اسلامی نظام کے لیے ہی ہے۔ سودی بینکوں کو بھی ان اداروں کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اسلامی بینکوں کو ہے۔ جن ملکوں میں ایسے ادارے موجود ہیں وہاں بینک زیادہ بہتر خدمات انجام دے سکتے ہیں اور اپنے ملک کی اقتصادی ترقی میں زیادہ فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستان میں سودی بینکوں کو بھی قرضوں کے وقت پر ادا نہ ہونے کی وجہ سے جو مشکلات درپیش ہیں اس کا ایک بڑا سبب ان اداروں کا فقدان ہے۔

دو چیزیں لوگوں کو ایمان داری پر مجبور کرتی ہیں ایک آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس اور دوسرے دنیا کے اندر رسوائی اور سزا کا خوف۔ آخرت میں سزا کا تصور چوں کہ سب لوگوں کے ذہن میں پختہ نہیں ہوتا اس لیے دنیا میں رسوائی اور سزا سے کوئی مفر نہیں۔ اسلام نے ان دونوں پر زور دیا ہے اگر کوئی اپنی دکان کو تالا نہ لگائے تو چوری تو ہوگی اور اگر حکومت چوروں کو پکڑے نہیں اور پکڑے تو سزا نہ دے تو پھر چوری کی وارداتیں بڑھ جائیں گی، کم نہیں ہوں گی۔ اگر حکومتیں اس معاملے میں تساہل برتیں اور پھر بھی یہ توقع کریں کہ چوری، ڈکیتی، دھوکہ دہی اور قتل و غارت گری نہ ہوگی تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ عموماً ایسا وہ حکومتیں کرتی ہیں جو مطلق العنان ہوتی ہیں اور لوگوں کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتیں۔ جب غلط کار لوگوں کو سزا نہیں ملتی تو عدل و انصاف کا خون ہوتا ہے اور معاشرہ تباہی کی طرف گام زن ہوتا ہے۔ یہی قرآن کا بھی اٹل فیصلہ ہے کہ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا o (طٰہٰ :۱۱۱) ''جس نے ظلم کیا وہ تباہ ہوا۔'' رسول اکرم ﷺ کی کئی احادیث بھی یہی بتاتی ہیں اور مسلمان مفکروں نے بھی اسی بات پر زور دیا ہے۔

جمع کھاتوں (Deposits) میں کمی

دوسرا اعتراض جو اسلام کے بینکاری کے نظام پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسے نظام میں جہاں بینک میں رقم جمع کرانے والوں کو نفع و نقصان میں شریک ہونا پڑے وہاں لوگ اس ڈر سے کہ انھیں نقصان ہوگا اپنی رقمیں بینکوں سے نکال لیں گے۔

اس امر کا کوئی اندیشہ نہیں، کیوں کہ اسلامی بینکوں میں بھی دوسرے بینکوں کی طرح مختلف اقسام اور مدتوں کے کھاتے رکھنے کی گنجائش ہوگی۔ ان میں فوری وصولی کے کھاتے (Demand Deposits) بھی ہوں گے اور مختلف خطرات اور مدت والے مضاربہ کھاتے بھی۔

فوری وصولی کے کھاتوں پر چوں کہ کوئی نفع نہیں دیا جاتا اس لیے وہ نقصان میں بھی شریک نہیں ہوں گے۔ اس بات کو حتمی بنانے کے لیے بچتوں کے انشورنس (Deposit Insurance) کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کو یہ اطمینان ہو کہ ان کے کھاتے ہر خطرے سے محفوظ ہیں۔[۱۴] تاہم مضاربہ کھاتوں پر نفع و نقصان میں شراکت کا اطلاق ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ نقصان کو ختم کرنے یا کم سے کم کرنے کے لیے جو ذرائع معلوم ہیں وہ اختیار نہیں کیے جائیں۔ مثلاً

انتظامی خوش اسلوبی (Corporate Governance) پر آج کل زور دیا جا رہا ہے تا کہ ہر بینک کی انتظامیہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کرنے پر مجبور ہو۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اندرونی نگرانی (Internal Audit) اور خارجی جانچ پڑتال (External Audit) دونوں موثر (Effective) ہوں۔ اس کی بھی ضرورت ہوگی کہ بینک انتظامیہ خطرات کے تعین اور ان سے بچنے (Risk Management) کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرے۔ اپنے اثاثوں کو اس طرح استعمال کریں (Diversity) کہ ایک جگہ کے نقصان سے پوری رقم نہ ڈوب جائے بلکہ دوسری جگہوں کے فوائد سے اس کی تلافی ہو جائے۔ خطرات کے مقابلے کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ نفع بخش سالوں میں بینک کا سارا نفع تقسیم نہ کر دیا جائے، بلکہ محفوظ کی ہوئی رقم (Reserves) بڑھائی جائے۔ تا کہ نقصان والے سالوں میں کھاتہ داروں کو نقصان سے بچایا جا سکے۔

مرکزی بینک کو بھی اس سلسلے میں قانون سازی (Regulation) اور تفتیش (Supervision) کے ذریعہ اپنا کردار پوری طرح ادا کرنا ہوگا تا کہ اس بات کی یقین دہانی کی جا سکے کہ بینکاری کا نظام ٹھیک چل رہا ہے۔ یہ سب کچھ صرف اسلامی بینکوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام بینکوں کے لیے ضروری ہے اور آج کل دنیا بھر میں اس پر زور دیا جا رہا ہے۔ اگر مرکزی بینک اپنے فرائض ٹھیک سے انجام نہ دے اور سیاسی نظام کے فاسد ہونے کی وجہ سے سیاسی بنیادوں پر قرضے دیئے جاتے ہوں تو کوئی نظام ٹھیک نہیں چل سکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نقصان کا امکان پھر بھی باقی رہے گا۔ اگر نقصان کے اندیشے سے کاروبار اور حصص پر مبنی کمپنیوں (Joint Stock Companies) میں سرمایہ کاری میں کمی نہیں ہوئی تو یہ سوچنا حقیقت پسندانہ نہ ہوگا کہ نفع و نقصان میں شراکت کی وجہ سے مضاربہ کے کھاتوں میں کمی واقع ہو جائے گی۔ مضاربہ کی بھی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں، مثلاً وہ جن میں نقصان کا خطرہ کم مگر نفع بھی کم ہے اور وہ جن میں نقصان کا خطرہ زیادہ مگر نفع بھی زیادہ ہے تا کہ ہر قسم کے کھاتہ داروں کو ان کے حوصلے کی مناسبت سے خدمت فراہم کی جا سکے۔

نفع و نقصان میں شرکت کا ایک فائدہ ضرور ہوگا کہ بینکوں میں رقمیں جمع کرانے والے زیادہ محتاط ہو جائیں گے۔ وہ اپنے بینکوں پر زیادہ کڑی نظر رکھیں گے اور زیادہ معلومات طلب کریں گے جس سے شفافیت بڑھے گی اور بینکوں کی صحیح حالت کا لوگوں کو اندازہ ہوگا۔ بینک بھی قرضے دینے میں زیادہ محتاط ہو جائیں گے اور پورے بینکاری کاروبار میں زیادہ بہتر ڈسپلن

پروان چڑھے گا۔ بینکوں میں ڈسپلن کی اس لیے کمی واقع ہوتی ہے کہ ضمانت پر پورا اعتماد کرنے کے باعث وہ قرض لینے کے مقصد کو اچھی طرح نہیں پرکھتے اور سٹے اور ایسے ہی دوسرے غیر ضروری اور پُرخطر مقاصد کے لیے بھی قرضے دے دیتے ہیں۔ نفع و نقصان میں شراکت سے اس قسم کے قرضوں میں کمی آئے گی۔ بینکوں کا نظام بہتر ہوگا اور عدم استحکام میں بھی کمی واقع ہوگی۔

اب تک کی کامیابیوں کا احوال

پہلا مکمل اسلامی بینک دُبئی میں مارچ ۱۹۷۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد جلد ہی دوسرے بینک قائم ہونا شروع ہوگئے۔ ۱۹۹۷ء کے آخر تک دنیا بھر میں ۱۷۶ بینک اور مالیاتی ادارے قائم ہوگئے تھے ان کے مجموعی اثاثے ۱۴۷ء۷ بلین ڈالر تک پہنچ گئے تھے۔ ان اعداد و شمار میں وہ کھڑکیاں شامل نہیں جو روایتی بینکوں نے مسلم اور غیر مسلم ممالک میں ان لوگوں کی بچتیں حاصل کرنے کے لیے کھولی ہیں جو سود سے بچنا چاہتے ہیں۔ تازہ ترین معلومات میسر نہیں لیکن مختلف اندازوں کے مطابق سب ملا کر مجموعی اثاثے اب تک ۲۰۰ سے ۳۰۰ بلین ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔ اس تیز رفتار ترقی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی بینکاری کا نظریہ نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ اس کی افادیت بھی مسلّم ہے۔ OECD کے ترقیاتی مرکز (Development Centre) کی ڈائریکٹر Dr. Traute Wohlers Scharf اپنی کتاب میں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ ''اسلامی بینکنگ مسلم آبادی کے ان طبقات کے لیے بھی کشش رکھتی ہے جو اب تک دینی وجوہات کی بنا پر بینکاری کے دائرے سے باہر تھے۔ ان بینکوں نے اپنے حصہ داروں اور مضاربہ کھاتہ داروں کے لیے منافع بھی کافی کمایا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیر سودی نظام کا تصور جدید دور میں بھی قابل عمل ہے۔''(۱۵)

اس تیز ترقی سے بھی زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس موضوع پر علمی کتب اور رسائل میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ یہ کتابیں اور رسائل صرف اسلامی ممالک میں ہی نہیں بلکہ امریکہ اور یورپ میں بھی شائع ہوئی ہیں اور صرف مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں نے بھی لکھی ہیں۔ اس طرح لوگوں میں اسلامی سرمایہ کاری کا فہم آج سے ۲۵ سال پہلے کے مقابلے میں کافی بڑھا ہے جہاں پہلے بہت کم لوگ مضاربت اور مشارکت اور اسلامی بینکاری کی دوسری

اصطلاحوں سے واقف تھے۔ اب یہ اصطلاحیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ اسلامی بینکوں کو درپیش بہت سے مسائل حل کرنے کے لیے بڑی تعداد میں اجتہادی نوعیت کے فیصلے ہوئے ہیں اور اعلیٰ معیار کا علمی کام ہوا ہے۔ جو قانون سازی کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرے گا۔

صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اور صرف اسلامی ترقیاتی بینک اور مسلمان فقہی ادارے ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بین الاقوامی ادارے بھی دل چسپی لینے لگے ہیں۔ ان میں آئی۔ ایم۔ ایف، ورلڈ بینک اور بی۔ آئی۔ ایس بھی شامل ہیں۔ مغربی ممالک میں مختلف یونی ورسٹیوں نے بھی دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ ان میں امریکہ کی ہارورڈ لا (Law) اسکول اور رائس یونیورسٹی اور برطانیہ کی لفبرو (Loughborough) اور ڈرھم یونی ورسٹیاں اور لندن اسکول آف اکنامکس بھی شامل ہیں۔ بعض یونی ورسٹیوں نے تو اس موضوع پر سیمینار اور کانفرنسیں بھی منعقد کی ہیں اور ماسٹر اور ڈاکٹر کی ڈگریوں کے پروگرام بھی شروع کر دیے ہیں۔

اسلامی سرمایہ کاری کے نظام میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گزشتہ تین دہائیوں میں بین الاقوامی مالیاتی نظام میں بار بار ہونے والے بحرانوں کے باعث اس نظام کے لیے ایک نئے قالب کی تلاش ہے۔ اس سلسلے میں جو علمی مواد میسر ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا یہ محسوس کر رہی ہے کہ مالیاتی نظام میں بہتر ڈسپلن داخل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ بھی محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر ذاتی بچت کی بنیاد پر سرمایہ کاری (Equity) پر زیادہ اور قرض پر کم انحصار کیا جائے تو بحرانوں کی شدت میں خاصی کمی ہو جائے گی۔ اس وجہ سے ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ اسلامی نظام کے سمجھنے میں اور اس کی افادیت تسلیم کرنے میں ہر اعتبار سے پیش رفت ہوئی ہے۔

مشکلات

اسلام کے مالیاتی نظام کو چند مشکلات کا بھی سامنا ہے ان میں سے کچھ مشکلات تو فطری ہیں جن کا سامنا ایک نئے تجربے کے ابتدائی مرحلے میں ناگزیر ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ زیادہ تر اسلامی بینک بہت چھوٹے ہیں۔ ان کے اوسط اثاثے ایک بلین ڈالر سے بھی کم ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے اثاثوں کا اس طرح پھیلاؤ (Diversify) نہیں

کر سکتے جس طرح خطرات کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کے پاس ایسا عملہ بھی نہیں جس کی مدد سے وہ منصوبوں کی چھان بین (Evaluation) اور نگرانی (Monitoring) کر سکیں۔

دوسرے یہ کہ چوں کہ بینک چھوٹے ہیں اور ان کا اپنا ذاتی سرمایہ بھی نسبتاً کم ہے اس لیے دو تین بڑے حصہ داران بینکوں کے فیصلوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ معاون اداروں (Shared Institutions) کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان بینکوں کو سب کام خود ہی انجام دینے پڑتے ہیں۔ ان کاموں میں سے ایک قرض لینے والوں کی ساکھ کے تعین کرنے (Credit Rating) کا کام ہے۔ اس وجہ سے وہ نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری نہیں کر پاتے اور ان کے زیادہ تر وسائل خرید وفروخت اور اجارے کی سرمایہ کاری میں صرف ہوتے ہیں۔ غیر سودی بینکاری کے فائدے اور برکات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری میں اضافہ نہ ہو۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک بیشتر معاون ادارے موجود نہ ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اسلامی ترقیاتی بینک اور مرکزی بینکوں کے تعاون سے کئی معاون ادارے بن گئے ہیں یا بننے کے مراحل میں ہیں۔

چوتھے یہ کہ بینکوں کے کھاتہ داروں اور قرض لینے والوں کی اکثریت اسلامی بینکاری کے اصل تصور اور مقصد سے پوری طرح واقف نہیں اور بینکوں کے ملازمین میں بھی جو زیادہ تر روایتی بینکوں سے آئے ہوئے ہیں صحیح فہم کی کمی ہے۔

پانچویں مشکل یہ ہے کہ ایک اسلامی مالیاتی منڈی کی غیر موجودگی کی وجہ ان بینکوں کو اپنے فاضل نقد (Excess Liquidity) نفع بخش طریقہ پر مختصر مدت کے لیے استعمال کرنے کی کوئی سبیل نہیں اور انہیں روایتی مالیاتی منڈی میں جانا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان پر تنقید ہوتی ہے۔ اسی طرح نقد کی تنگی (Liquidity Crunch) کی صورت میں ضروری نقد تک رسائی میں بھی مشکل پیش آتی ہے۔ کیوں کہ نقد کی تنگی کی صورت میں نقد فراہم کرنے والا کوئی ایسا ادارہ (Lender of Last Resort) نہیں جو غیر سودی طریقے پر نقد فراہم کرنے کے لیے تیار ہو، اس لیے یہ بینک روایتی بینکوں سے زیادہ نقد رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس سے ان کے منافع پر برا اثر

پڑتا ہے۔ ان مشکلات کی وجہ سے ان بینکوں کی ترقی تیز ہونے کے باوجود بھی اس رفتار سے کم ہے جو ہوسکتی تھی۔ لیکن توقع ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان مشکلات میں کمی واقع ہوگی اور ان حالتوں کے بدلنے سے ان کی ترقی کی رفتار میں مزید اضافہ ہوگا۔

مشکلات کا علاج

ان مشکلات کا کوئی ایسا حل نہیں ہے کہ جو فوری طور پر ایک بٹن دبا کر کیا جا سکے۔ لیکن بتدریج علاج کرنے کے لیے اقدامات کی کم از کم فوری طور پر ابتدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جتنا زیادہ ان اقدامات کو موخر کیا جائے گا۔ اتنا ہی ان مشکلات کو دور کرنے میں دشواری کا سامنا ہوگا۔ ان اقدام میں سے ایک یہ ہے کہ حکومت اور مرکزی بینک اپنے طرز عمل کو بدلیں اور اسلامی بینکاری کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

سازگار ماحول پیدا کرنے کے لیے کئی چیزیں درکار ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام کے اقتصادی اور مالی نظام کے لیے ضرورت کی مناسبت سے قانونی اصلاح کی جائے۔ یہ اصلاح موجودہ قوانین میں چند پیوند لگا دینے سے نہیں ہوگی بلکہ شریعت کے اعلیٰ مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے قانون سازی کرنے سے ہوگی، تاکہ یہی نہیں کہ اسلامی بینکاری کا نظام مضبوط ہو بلکہ یہ بھی کہ ساتھ ساتھ شریعت کے مقاصد کے حصول کی طرف پیش رفت ہو۔ قانون سازی کرتے وقت ان ساری کمزوریوں کو مدنظر رکھنا ہوگا جو ہمارے بینکاری کے نظام میں اس وقت موجود ہیں۔ ایک ناقص نظام کو جوں کا توں اسلام کی گود میں ڈالنا اسلام کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔

اس کی بھی ضرورت ہے کہ تربیت کا معقول انتظام کیا جائے۔ اس بات کو مدنظر رکھنے کی حاجت ہے کہ صرف کھاتہ داروں، قرض لینے والوں اور عام پبلک ہی کی تربیت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ کہ بینکوں کے ڈائریکٹروں، انتظامیہ اور عملے کو بھی تربیت کی ضرورت ہے۔ ان سب کو اس چیز کا اچھا فہم ہونا چاہیے کہ اسلامی بینکاری کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور اس میں اور سودی بینکاری کے نظام میں کیا فرق ہے؟ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ قرضے لینے والوں کی ساکھ کا اندازہ ہو۔ اس مقصد کے لیے کریڈٹ ریٹنگ ایجنسیوں کا قیام ناگزیر ہے۔

محاسبہ اور تفتیش کے نظام کو بھی بہت بہتر بنانے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی رپورٹ

سے یہ اندازہ ہوسکے کہ حسابات ایمان داری سے رکھے گئے ہیں یا نہیں اور جو نفع بتایا گیا ہے وہ صحیح ہے؟ اس کی بھی حاجت ہے کہ تمام بینک مل کر ایک ایسا تفتیشی ادارہ (Audit Organization) بنائیں جس کے پاس کوئی بھی ممبر بینک اس تاجر کو بھیج سکے جس کے بارے میں اسے شک ہے کہ اس نے بینک کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ ایسے مشترک اداروں کے نہ ہونے کی صورت میں ہر بینک کو تفتیش کے لیے جو انتظام خود کرنا ہوتا ہے اس سے اس کی لاگت بہت بڑھ جاتی ہے۔

ایوان ہائے تجارت اور تاجروں کی تنظیموں میں بھی یہ شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ان تاجروں اور صنعت کاروں کا معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کریں جو بے ایمانی کرتے ہیں اور یہی نہیں کہ بینکوں کو دھوکہ دیتے ہیں بلکہ اپنے گاہکوں اور حصے داروں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ یہ بھی ناگزیر ہے کہ شرعی اور بینکی عدالتیں قائم کی جائیں تاکہ بینکوں سے متعلق نزاعات کے ساتھ تیزی سے نمٹا جاسکے۔

ان بہت ساری اصلاحات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک یہ عمل میں نہ آجائیں اسلامی بینکاری کے نظام کی طرف پیش رفت نہیں کی جائے گی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان اصلاحات کو سنجیدگی سے نافذ اسی وقت کیا جائے گا جب ان کی شدت سے اسلامی نظام کی حمایت اور تقویت کے لیے ضرورت پڑے گی۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلامی نظام فوری طور پر کسی چھڑی کے گھمانے سے نہیں آجائے گا وہ بتدریج ہی آسکتا ہے۔ تدریج میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ رسول اکرم ﷺ نے خود بھی بہت سی اصلاحات کو معاشرے میں بتدریج نافذ کیا تھا۔ لیکن تدریج کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جن اقدام کی ضرورت ہے ان کی طرف پیش قدمی ہی نہ کی جائے یا اس میں سستی برتی جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو نظام کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے گا۔ اس لیے ہمارے بعض ارباب حل وعقد کا یہ کہنا بالکل قابل قبول نہیں کہ اسلامی نظام کو وہ اس وقت تک نافذ نہیں کرسکتے جب تک معاشرے کی اصلاح نہ ہوجائے۔ جہاں معاشرے کی اصلاح ناگزیر ہے وہاں اس نظام کے قیام کے لیے اخلاص اور مستعدی کے ساتھ ضروری اداروں کے قیام کی بھی ضرورت ہے۔ جیسے جیسے موجودہ نظام کی اسلامی خطوط کے دائرے میں اصلاح ہوتی جائے گی اور معاون ادارے جڑ پکڑتے جائیں گے ویسے ہی اسلامی نظام بھی مضبوط ہوتا جائے گا اور اس کے

ثمرات سے لوگ مستفید ہوں گے۔

اس سے خود حکومت کو بھی فائدہ ہوگا کیوں کہ کوئی سیاسی لیڈر اس وقت تک مقبول اور ہر دل عزیز نہیں ہوسکتا اور کوئی حکومت چل نہیں سکتی جب تک کہ لوگ اس سے خوش نہ ہوں۔ اس لیے پاکستان جیسے ملک میں سیکولرازم کے بیج بونے اور اسلام کو پس پشت ڈالنے کی کوشش سے نہ حکومت مضبوط ہوسکے گی اور نہ ہی ملک تیز رفتار ترقی کی راہ پر گام زن ہوسکے گا۔ اس لیے حکومت اور عوام دونوں کا بھلا اس میں ہے کہ اسلام کو اخلاص کے ساتھ بتدریج نافذ کیا جائے۔ دنیا کو ایک نئے نظام کی ضرورت ہے جو نہ صرف یہ کہ اقتصادی ترقی فراہم کرسکے بلکہ لوگوں کی اخلاقی حالت کو بھی جلا دے سکے۔ خاندانی نظام مضبوط کرسکے، اقتصادی عدم مساوات کو کم کرسکے اور لوگوں کے اندر اخوت و محبت کے رشتے جوڑ سکے۔ اسلام میں یہ صلاحیت مسلمانوں کے صدیوں کے انحطاط کے باوجود اب بھی موجود ہے۔ اگر ہم ارادہ کرلیں اور پُر خلوص کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے ساتھ ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں یقین دلایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَاo ''جو لوگ ہماری راہ میں جدو جہد کریں گے ہم ضرور ان کی اپنے راستوں کی طرف رہ نمائی کریں گے۔''

روشن مستقبل

بے شمار مشکلات کے باوجود جن میں سرفہرست بہت سے مسلمان ملکوں کی سرد مہری ہے۔ اسلامی بینکاری کا نظام پچھلے ۲۵ سالوں میں تیزی سے ترقی کر کے مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوچکا ہے۔ اس تحریک سے بہت سے باصلاحیت، مخلص اور پر عزم لوگوں کی بڑی تعداد وابستہ ہے جو اس نظام کو آگے بڑھانے اور اس کی مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ احیائے اسلام کے ساتھ ساتھ یہ نظام بھی مضبوط تر ہوتا جائے گا۔ سوال اس نظام کے مستقبل کا نہیں، وہ تو روشن ہے ہی، سوال اس بات کا ہے کہ ہم اس کی مدد کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن سرخرو ہونا چاہتے ہیں یا اس کی راہ میں روڑے اٹکا کر دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے عذاب کے مستحق بننا چاہتے ہیں؟

حواشی باب سوم

(۱) مضاربت اس معاہدے کو کہتے ہیں جس میں ایک یا اس سے زیادہ اصحاب مالی سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور مضارب اپنی محنت اور صلاحیتوں سے اس کو حسب اتفاق نفع بخش کاموں میں لگاتے ہیں۔ نفع حسب معاہدہ سب میں تقسیم ہوگا لیکن نقصان کی صورت میں اصحاب مال اسے برداشت کریں گے۔ مضارب کا نقصان یہ ہوگا کہ اسے اپنی محنت اور صلاحیتوں کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔

(۲) مشارکت اس معاہدے کو کہتے ہیں جس میں سبھی شریک سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور محنت اور صلاحیتیں بھی۔ نفع حسب معاہدہ تقسیم ہوگا لیکن نقصان ان کے سرمایہ میں حصہ کے تناسب سے تقسیم ہوگا۔

(۳) شافعی مسلک کی رو سے نفع کی بھی تقسیم سرمایہ کے تناسب سے ہی ہونی چاہیے۔ یہ رائے اس مفروضے پر مبنی ہے کہ محنت اور صلاحیتوں کا جو حصہ مجموعی نفع میں ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے اور یہ کہ تمام حصہ دار اپنے سرمایہ اور نفع میں شرکت کی مناسبت سے محنت اور صلاحیتوں کو بھی کام میں لائیں گے۔

(۴) یوڈووچ، ۱۹۷۰، ص ۱۸۰ اور ۲۶۱

(۵) یوڈووچ، ۱۹۸۱، ص ۲۵۷ اور ۲۶۸

(۶) گوئٹائن (Goitein)، ۱۹۶۷، ص ۲۳۵ اور ۲۵۰، اس کے علاوہ دیکھیے، گوئٹائن ۱۹۶۶، ص ۲۷۴-۲۷۱ جنیزہ دستاویزات آثار قدیمہ کی دریافت کے سلسلے میں کھدائی کے درمیان مصر میں میسر ہوئی تھیں اور ان کی تحلیل کافی عرق ریزی کے ساتھ پروفیسر گوئٹائن نے کی تھی۔

(۷) شائزطر، ۱۹۹۴، ص ۱۰۲۔

(۸) فِشل (Fischel)، ۱۹۹۲

(۹) دوری، ۱۹۸۶، ص ۸۹۸

(۱۰) یوڈووچ، ۱۹۸۱

(۱۱) کریمرز (Kramers)، ۱۹۵۲، ص ۱۰۰، اس کے علاوہ دیکھیے، Chapra 2000، ص ۲۵۲-۱۷۳

(۱۲) ان عوامل پر بحث کے لیے دیکھیے، (c) Chapra ,2000، ص ۲۵۲-۱۷۳

(۱۳) ان سب اداروں کے بارے میں دیکھیے (c) Chapra ,1985 ص ۸۱-۱۷۴، اور ,2000
Chapra & Khan، ص ۹۱-۸۵

(۱۴) اس کے لیے دیکھیے Chapra and Khan ,2000، ص ۶۵-۶۴

(۱۵) Wohlers - Scharf ,1983، ص ۱۲-۱۱

مصادر

عربی مصادر

(۱) ابن عربی، ابو بکر محمد (م ۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء)، احکام القرآن (قاهره: المطبعة البیهة، ۱۹۵۷)

(۲) ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل (م۷۷۴ھ، ۱۳۷۳ء) تفسیر القرآن الکریم (قاهره: عیسٰی البابی الحلبی، بدون تاریخ)

(۳) ابن منظور، محمد ابن مکرم (م ۷۱۱ھ/ ۱۳۱۱ء)، لسان العرب (بیروت: دار صادر للطباعة والنشر، ۱۹۶۸ء)

(۴) ابو زهرة، محمد، بحوث فی الربا (کویت: دار البحوث الاسلامیة، ۱۹۷۰ء)

(۵) الجزیری، عبد الرحمن، الفقه علی المذاهب الأربعة (قاهره: المکتبة التجاریة الکبری، بدون تاریخ)

(۶) الجصاص، ابو بکر احمد ابن علي (م۳۷۰ھ/۹۴۵ء)، احکام القرآن (قاهره: عیسٰی البابی الحلبی، ۱۹۵۷ء)

(۷) الرازی، فخر الدین (م۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء)، تفسیر الکبیر (طهران، دار الکتب العلمیه، ط۲، بدون تاریخ)

(۸) الزبیدی، محمد مرتضی (م۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء)، تاج العروس (قاهره: المطبعة الخیریة، ۱۳۰۶ھ)

(۹) السنهوری، عبد الرزاق، مصادر الحق فی الفقه الاسلامی (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۹۵۴)

(۱۰) الاصفهان، راغب (م۵۰۲ھ/۱۱۰۸ء)، المفردات فی غریب القرآن (قاهره: مصطفی البابی الحلبی، ۱۹۶۱ء)

(۱۱) القرضاوی، یوسف، فوائد البنوک هی الربا المحرم (قاهره: دار الصحوة، ۱۹۹۴ء)

(۱۲) القرطبی، محمد ابن احمد (م۶۶۳ھ/۱۰۷۰ء)، الجامع لاحکام القرآن (معروف بتفسیر القرطبی) (قاهره: دار الکتاب العربی، ۱۹۶۷ء)

انگریزی مصادر

(1) Bach, G.L. (1977), Economics, An Introduction to Analysis and Policy (Englewood Cliff, NJ: Prentice Hall, 9 th ed.)

(2) Bank for Intenational Settlements (BIS) (1998), Press Release, 22 June 1994 and 19 October.

(3) Bigsten, Arne (1977), "Poverty, Inequality and Development", in Norman Gemmell, ed., Surveys in Development Economics (Oxford: Basil Blackwell), pp. 135 - 77.

(4) Bokare, M.G. (1993), Hindu - Economics: Eternal Economic Order (New Delhi: Janaki Prakashan)

(5) Chapra M. Umer (1985), Towards a Just Monetary System (Leicester, U.K.: The Islamic Foundation, 1985)

(6) Chapra M. Umer (2000a), "Alternative Visions of International Monetary Reform", in M. Iqbal and D. Llewellyn (eds.) (2002), Islamic Banking and Finance: New Perspectives on Profit - Sharing and Risk (Cheltenhouse, UK: Edward Elgar)

(7) Chapra M. Umer (2000b), "Why has Islam Prohibited Interest: Rationale Behind the Prohibition of Interest in Islam", Review of Islamic Economics, NO.9, 2000, pp. 5-20.

(8) Chapra M. Umer (2000c), The Future of Economics: an Islamic Perspective, (Leicester: The Islamic Foundation), pp. 193- 252.

(9) Chapra M. Umer, and Tariqullah Khan (2000), "Regulation and Supervision of Islamic Banks", (Jeddah: IRTI/IDB).

(10) Duri, A.A. (1986), "Baghdad", The Encyclopedia of Islam (Leiden, E.S. Brill), Vol. 1, pp. 894 - 909.

(11) Fischel, W.J. (1992), "Djahbadh", in the Encyclopedia of Islam, Vol. 2, pp.382 - 3.

(12) Friendman, Milton (1982), "The Yo - Yo U.S. Economy" Newsweek, 15 February, p.4.

(13) Goitein, S.D. (1966), Studies in Islamic History and Institutions (Leiden: Brill).

(14) Goitein, S.D. (1967), A Mediterranean Society, (Berkley and Los Angeles: University of California Press).

(15) IMF, International Financial Statistics, November 1998 and Yearbook 2000.

(16) IMF, World Economic Outlook, May 1998 and December 1998.

Johns, C.H.W., et.al. (n.d.), "Usury", in James Hastings,

(17) Encyclopedia of Religion and Ethics (New York: Charles Seribner's Sons, n.d.), Vol. 12, pp. 548 - 58.

(18) Kindleberger, Charles (1978), Manias, Panics, and Crashes (London: MacMillan).

(19) Kramers, J.H. (1952), "Geography and Commerce", in T. Arnold and A. Guillaume (eds.), The Legacy of Islam (London: Oxford University Press).

(20) Mills, Paul, and John Presley (1999), Islamic Finance: Theory and Practice (London: MacMillan).

(21) Minsky, Hyman (1975), John Maynard Keynes (New York: Columbia University Press).

(22) Mishan, E.S. (1971), Cost Benefit Analysis: An Introduction (New York: Praeger).

(23) Morgan, Guarantee Trust Company of New York (1987), World Financial Markets, January.

(24) Noonan, John (1957), The Scholastic Analysis of Usury, (Cambridge, MA: Harvard University Press).

(25) OECD, Economic Outlook, December 1991, and June 2000.

(26) Peach, Richard, and Charles Steindel (2000), "A National of Spendthrifts? An Analysis of Trends in Personal and Gross Savings", Current Issues in Economics and Finance, Federal Reserve Bank of New York, Vol.6, No. 10, September.

(27) Robinson, Joan (1977), "What are the Questions?", Journal of Economic Literature, December.

(28) Rogoff, Kenneth (1999), "International Institutions for Reducing Global Financial Instability", The Journal of Economic Perspectives, Fall, pp. 211-46.

(29) Schatzmiller, Maya (1994), Labor in the Medieval Islamic World (Leiden: Brill).

(30) Simons, Henry (1948), Economic Policy for a Free Society (Chicago: University of Chicago Press).

(31) Udovitch Abraham (1981), "Bankers Without Banks: Commerce, Banking and Society in the Islamic of Middle Ages", Princeton Near East Paper NO. 30 (Princeton, NJ: Princeton University Press).

(32) Udovitch, Abraham (1970), Partnership and Profit in Early Islam (Princeton, NJ: Princeton University Press).

(33) Wohlers - Scharft, Traute (1983), Arab and Islamic Banks (Paris: OECD).

اقتصادیات اسلامی پر مصنف کی کتابیں

(1) Towards a Just Monetary System (Leicester, U.K.: The Islamic Foundation, 1985).
(2) The Economic System of Islam (Islamic Center, London, and the University of Karachi, 1970).
(3) Objectives of the Islamic Eonomic Order (Leicester, U.K.: The Islamic Foundation, 1977).
(4) The Islamic Welfare State and Its Role in the Economy (Leicester, U.K.: The Islamic Foundation, 1979).
(5) Islam and the Economic Challenge (Leicester, U.K.: The Islamic Foundation, 1992).
(6) Islam and Economic Development (Islamabad: The International Institute of Islamic Thought and the Islamic Research Institute, 1992).
(7) What is Islamic Economics? (Jaddah: Islamic Research and Training Institute/ Islamic Development Bank, 1996).
(8) The Future of Economics: an Islamic Perspective (Leicester: The Islamic Foundation, 2000).
(9) Prohibition of Interest: Does it Make Sense? (Durban: Islamic Da'wah Movement, August 2001).
(10) Regulation and Supervision of Islamic Banks, written in association with Tariqullah Khan (Jeddah: Islamic Research and Training Institute/ Islamic Development Bank, 2000).
(11) Corporate Governance in Islamic Financial Institutions, written in association with Habib Ahmed (Jeddah: IRT/IDB, Occasional Paper No.6, 2002).